www.urducouncil.nic.in
فروری 2018، قیمت:- /10₹
ماہنامہ
بچوں کی دنیا
نئی دہلی
Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے ،اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ:15 روپے، سالانہ:150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون:26109746، فیکس:26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد: 6 شمارہ: 02 فروری 2018

مدیر: پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی -110025
فون: 49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی -110066
فون: 26109746
ای میل: sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد -500002
فون: 040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
مضمون	لیموں کی تتلی	شمس الاسلام فاروقی	06
نظم	آڑے وقتوں میں	مظفر حنفی	08
مضمون	نوبل انعام	احرار حسین	09
نظم	رونق بزم جہاں	شاہد ساگری	12
مضمون	قیمتی لکڑی اور خوبصورت پتوں کا درخت — ساگوان	مسرت جہاں	13
ڈراما	غلط فہمی	افتخار انیس صدیقی	17
نظمیں	آؤ بچو! کریں ڈرامہ	رفیق گلاب	19
	منگل یان	متین اچل پوری	19
مضمون	5G نیٹ ورک	نسیم سعید	20
نظم	اردو	جلال الدین خاں راج	22
کہانیاں	سچی کہانیاں	قاضی مشتاق احمد	23
	چالاک کون؟ چور یا سپاہی	محمد مقصود احمد رضوی	27
	گاؤں کا سپوت	شفیق الرحمن صدیقی	29
	لائف اسٹائل	منظر مظفر پوری	32
	عقل مند بڑھیا	سید قمر الحسن	34
نظم	ترانۂ اتحاد	مرتضیٰ ساحل تسلیمی	37
کہانیاں	چراغ	ہارون اختر	38
	سمندر کی گہرائی	منظور احمد صدیقی	40
باتصویر کہانی	کھانے کی کھیر	ذکیہ مشہدی	42
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	47
کہکشاں	چمن چمن کے پھول		53
	بڑے لوگ بڑی باتیں		54
	پنسل کا سفر	مصباح	55
	مدد	فائزہ نوشاد	56
	سبق	شمائلہ گل نجمی	57
	ہنسی کے غبارے		59
ننھے فنکار	بچوں کی پینٹنگ		60
آپ کی باتیں	اردو فیس بک		62

آپس کی باتیں

دوستو! ہمارا سماج بدل رہا ہے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہمارا ذہن بھی تبدیل ہوا ہے۔اب ہمارا سماج تعلیم سے زیادہ دوسری چیزوں پر توجہ دے رہا ہے پھر بھی خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک بڑا طبقہ تعلیم سے جڑا ہوا ہے اور زمانے کے نئے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے تعلیمی نصاب اور طریقہ کار کو اختیار کر رہا ہے۔آج کے دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

پیارے بچو! آپ کو پتہ ہے کہ اب سائنس کی بہت سی کتابیں اردو میں بھی دستیاب ہیں اور ان کتابوں کے ذریعے آپ سائنس کی بنیادی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔اگر آپ کا میڈیم اردو ہے تو آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اردو میں بھی اب سائنسی مواد موجود ہے۔اگر آپ اپنی مادری زبان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی کتابیں پڑھتے ہیں تو اس سے آپ کو بہت ساری چیزیں سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اس کے ذریعے آپ آگے چل کر انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی سائنس کی معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔اس لیے شروع میں اپنی مادری زبان کو ہی اختیار کیجیے کیونکہ مادری زبان کے ذریعے آپ آگے بڑھ سکتے ہیں۔مادری زبان بہت حد تک آپ کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔ بہت سے لوگ مادری زبان کے ذریعے ہی اونچے مقام تک پہنچے ہیں۔اس لیے مادری زبان سے اپنا رشتہ قائم رکھیے کہ یہی زبان آپ کے لیے نئے خوابوں کی زمین تیار کر سکتی ہے۔آپ کبھی یہ نہ سوچیے کہ ذہنی اور معاشی طور پر کمزور ہیں، ہماری تاریخ میں بہت سے بڑے لوگ رہے ہیں جو پہلے بہت کمزور تھے مگر بعد میں مضبوط ثابت ہوئے۔ بہت سے بڑوں کا بچپن آپ دیکھیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ پہلے ان بڑوں کو کتابوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ پڑھنے میں ان کا دل نہیں لگتا تھا مگر بعد میں جب انھوں نے پڑھنے میں دلچسپی لی تو تاریخ میں اپنا نام سنہرے حرفوں میں درج کرایا۔آپ نے نیوٹن کا نام سنا ہوگا۔وہ ایک بڑے سائنس داں تھے مگر بچپن میں پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ان کی ماں انھیں اناج بیچنے کے لیے بازار بھیجتی تھی اور انھیں کسان بنانا چاہتی تھی مگر اپنی محنت سے نیوٹن کسان کے بجائے ایک بڑے سائنس داں بن گئے اور انھوں نے سائنس میں جو کتاب لکھی وہ دنیا میں بہت اہم سمجھی گئی۔یہ اس لیے ممکن ہوا کہ انھوں نے کتابوں میں دلچسپی لی اور اپنی محنت سے اپنے لیے ایک نیا میدان عمل اختیار کیا۔جتنی بڑی شخصیتیں گزری ہیں آپ ان کے بچپن کا مطالعہ کریں تو اس سے آپ کو نئی روشنی ملے گی، نئی طاقت ملے گی۔آپ کے اندر بھی ایک نیا جذبہ جاگے گا اور آپ بھی ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے خوابوں کو پورا کر سکیں گے۔ آپ نظیر اکبرآبادی، مولوی اسمٰعیل میرٹھی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی اور دوسری بڑی شخصیتوں کے بچپن کا مطالعہ ضرور کریں، ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے آپ کے ذہن پر بہت اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور آپ کو پتہ چلے گا کہ ہمارے بعض بزرگوں کا بچپن کن تکلیفوں میں گزرا تھا لیکن انھوں نے ان تکلیفوں میں بھی ایک نیا راستہ نکالا اور سماج کو اپنے خیالات سے روشن کیا۔آج ہمارے سماج کو روشنی کی کتنی ضرورت ہے یہ آپ کو پتہ ہے۔آپ بھی مطالعے کے ذریعے سماج کو روشن کر سکتے ہیں۔سماج کو بہتر بنانے میں آپ کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔

تازہ شمارے میں آپ کے لیے بہت اچھی تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ان تحریروں سے بھی آپ کے ذہن کو تحریک ملے گی۔آپ ان تحریروں کو پڑھ کر کچھ لکھنے کی کوشش کیجیے کیونکہ ابھی سے آپ مشق کریں گے تو مستقبل میں بڑے ادیب یا تخلیق کار بن سکتے ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ ہمارے بچوں میں بھی بہت سے ادیب ہیں جنھوں نے کم عمری میں اچھی تخلیقات دی ہیں۔آپ ان کی تحریریں پڑھیں اور دیکھیں کہ ان بچوں نے کس طرح ہمارے سماج کو دیکھا اور محسوس کیا ہے اور اپنی تحریروں میں اس سماج کو پیش کیا ہے۔

آپ کا

ارتضیٰ

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

میں MA (انگلش) کی ایک طالبہ ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' کا مطالعہ پچھلے کچھ مہینوں سے کر رہی ہوں۔ ہم اردو والوں کی اردو کی تشنگی بجھانے کے لیے اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ یہ رسالہ ہمارے درمیان پہنچ رہا ہے۔

ملکہ تبسم، ریل پار، اوکے روڈ، نزد آر سی اچ ہاسپٹل، آسنسول، مغربی بنگال

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ستمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ سچ بتاؤں تو بچوں کے ساتھ یہ رسالہ بڑے بھی بہت پابندی سے پڑھتے ہیں۔ سائنسی مضامین اور قسط وار ناول 'زمین کی تہہ میں' میں پابندی سے پڑھتا ہوں۔ اس مہینے کا نیا کالم 'بچوں کی لائبریری' بھی بہت خوب ہے۔ یوم اساتذہ کی مناسبت سے نظمیں بہت پسند آئیں۔ اس ماہنامے کی کہانیاں بھی بہت اچھی ہیں۔

سید اسد تابش، اکولہ، مہاراشٹر

میں گورنمنٹ اردو اسکول نمبر 6 رانی نبور ریاست کرناٹک میں ایک صدر مدرس کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں جہاں پر اول جماعت تا آٹھویں جماعت کل 280 بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ بچوں کی ایک لائبریری قائم کرنا چاہتا ہوں تاکہ بچے اردو کتابیں اور میگزین پڑھ سکیں۔ بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی جانب سے بہت مفید کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر سید علی کریم (ارتضٰی کریم) کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بچوں کی دنیا، خواتین دنیا اور اردو دنیا میگزین کی ترتیب میں آپ کی محنت شامل ہے۔

محمد رفیق تاشیوک، رانی بنور، کرناٹک

'بچوں کی دنیا' کا دسمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ مختار ٹونکی کا مضمون پڑھا۔ اس مضمون نے مجھے 45 سال پہلے کے اسکول کی یاد دلائی ہے۔ مولا بخش کے بارے میں جو معلومات ہم بھول گئے تھے وہ دہرائی گئی ہیں۔ بچوں کے لیے بہت ہی اچھا مضمون ہے۔ انصاری اسما اسلم کا مضمون سیلفی اور اس کے نقصانات ان بچوں کے لیے جو سیلفی ہر جگہ کھینچ رہے ہیں بے حد مفید ہوگا۔ سید مظہر سلطانہ کا مزاحیہ پیغام بہت ہی پسند آیا۔ بچوں کی دنیا علم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔

ڈاکٹر غوثیہ سعیدہ، چینئی، تمل ناڈو

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' آن لائن زیر مطالعہ رہتا ہے۔ ادب اطفال کے فروغ میں نہایت عمدہ رسالہ ہے۔ سبھی مشمولات دلچسپ ہوتے ہیں۔ ماہ نومبر کے شمارے میں اے پی جے عبدالکلام سے متعلق 'تعزیتی کلام' بہترین ہے۔ کہانیاں سبق آموز ہیں۔ دوسرے مضامین اور نظمیں بھی دلچسپ اور معلوماتی ہیں، مختلف رنگوں اور تصاویر سے مزین رسالہ دیدہ زیب اور بچوں کے اندر لکھنے، پڑھنے کے شوق کو بڑھاوا دینے میں معاون ہے۔

عاتکہ ماہین، اے ایم یو، علی گڑھ

شمس الاسلام فاروقی

لیموں کی تتلی

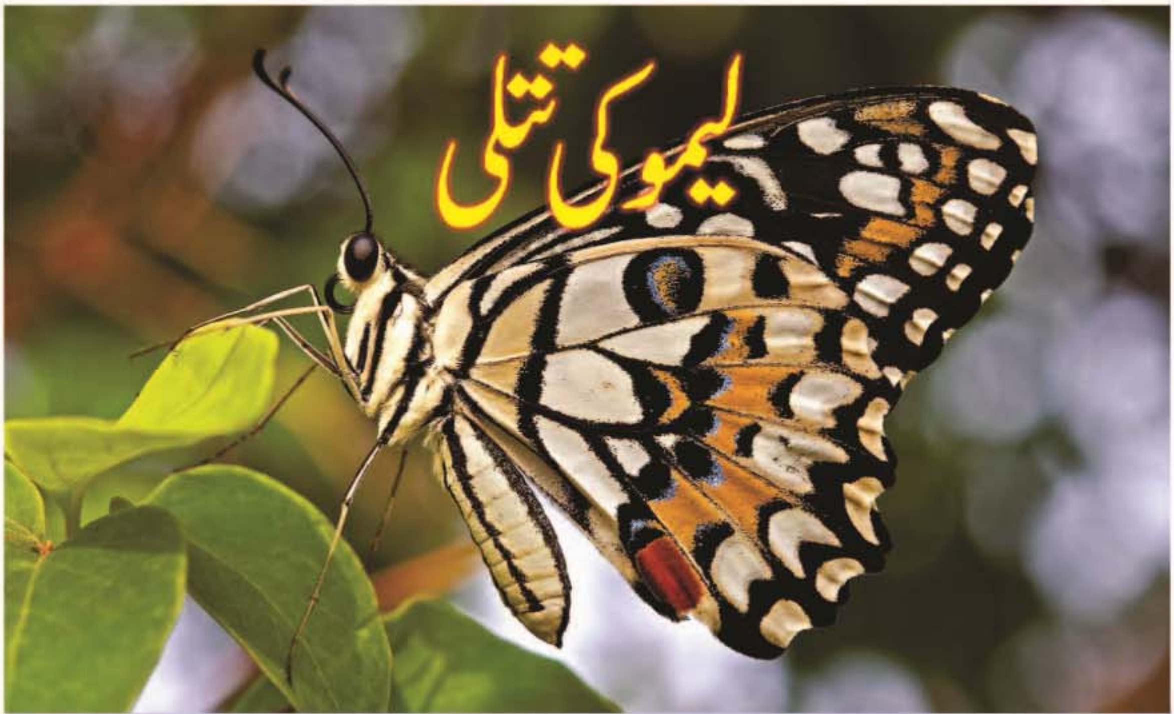

میں ایک تتلی ہوں۔ تتلیاں تو ہزاروں قسم کی ہوتی ہیں مگر میں لیموں کی تتلی کہلاتی ہوں۔ انگریزی زبان میں میرا نام لیمن بٹر فلائی ہے اور سائنسی نام ذرا مشکل پوپی لیو۔ ڈی مولی اُس (Popilio demoleus) ہم تتلیوں کا ماتھس (Moths) یعنی پروانوں سے بہت قریبی تعلق ہے بس فرق یہ ہے کہ ہمارے پَر مقابلتاً زیادہ پھیلے ہوئے، پیٹ پتلا اینٹنی بغیر شاخوں کے ہوتے ہیں اور ہم ہمیشہ دن کے وقت باہر نکل کر اپنی غذا تلاش کرتے ہیں جبکہ ماتھن کے پر قدرے پتلے، پیٹ، موٹا اور اینٹنی شاخدار ہوتے ہیں اور وہ صرف رات ہی میں باہر نکلتے ہیں۔

میری مرکب آنکھیں بڑی بڑی اور اینٹنی سیدھے اوپر کی طرف تنے ہوئے رہتے ہیں۔ آپ مجھے میرے پروں سے پہچان سکتے ہیں۔ میرے پچھلے پروں کے باہری کنارے پر لہردار کٹاؤ ہوتے ہیں اور پروں پر کالے، زرد اور نارنجی دھبّے پڑے ہوتے ہیں۔ میں اپنے پروں کی مدد سے کسی پرندے کی طرح تیزی سے اڑتی ہوں۔ چھوٹے بچے مجھے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں مگر میں ان کے ہاتھ نہیں آتی۔ لیکن اگر کبھی اتفاق سے میں کسی بچے کے ہاتھ لگ گئی تو اس کی انگلیوں کے دباؤ سے میرے پَروں کے نقش و نگار بہت آسانی سے خراب ہوجاتے ہیں۔ دراصل جب میں بڑی ہورہی ہوتی ہوں تب میرے پروں کے خلیوں سے رنگین مادہ نکل نکل کر پروں کی اوپری سطح پر جمنے لگتا ہے اور اسی سے یہ خوب صورت نقش بن جاتے ہیں۔ یہ اتنے نازک ہوتے ہیں کہ ہاتھوں کی معمولی حرکت سے بھی مٹنے لگتے ہیں۔ میرے ہی پروں میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ سب ہی تتلیوں اور پروانوں کے پر بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔

میری غذا پھولوں کا رس ہے جو ان کے نچلے حصے میں بھرا ہوتا ہے۔ اسے پینے کے لیے میرے منہ میں ایک لمبی سی

ٹیوب ہے۔ ذرا نیچے جھک کر دیکھیے میں اسے گول گول لپیٹ کر اپنے منہ کے نیچے چھپائے رکھتی ہوں۔ جب پھول پر بیٹھتی ہوں تب اسے سیدھا کر کے پھول کے اندر گھسا دیتی ہوں اور جب اس کا سرا رس میں ڈوب جاتا ہے تب سانس اوپر کھینچ کر اسے پی جاتی ہوں۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں میں خاصی خوب صورت اور رنگ دار ہوں۔ مجھے باغات میں اِدھر سے اُدھر اڑتا دیکھ کر لوگ بہت خوش ہوتے ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ میں خوب صورت اور دلکش ہونے کے باوجود ان کے لیے کتنی نقصان دہ ہوں۔ میں لیمو کے چھوٹے نرسری میں لگے پودوں کے پتوں پر انڈے دے دیتی ہوں۔ لیمو کے علاوہ کیریا پاک یعنی میٹھا نیم بھی مجھے بہت پسند ہے۔ ان دونوں پودوں کے پتوں پر جب انڈوں سے ننھے ننھے لاروے نکلتے ہیں تو وہ ان کے نرم پتوں کو کھانا شروع کر دیتے ہیں۔ میرے لاروے جب تک پورے بڑے ہوتے ہیں وہ پودوں کو بالکل اجاڑ کر دیتے ہیں یہاں تک کہ ان کی بڑھت ہی رک جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ لاروے سکڑ کر پیوپوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پیوپوں کے خول کے اندر میری جیسی تتلی بننا شروع ہو جاتی ہے اور جب پوری بن جاتی ہے تو پیوپے کا خول توڑ کر باہر نکل آتی ہے۔ نرسری میں پودے اُگانے والے عام لوگوں کی طرح مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے بلکہ وہ زہریلی دوائیں استعمال کر کے مجھے مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

■

Shamsul Islam Farooqui
90-B, Ahata Talib, Noor Nagar
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

جوابات

نظم

آڑے وقتوں میں

جب مجھ پر آفت آئی تھی
میں تھا مجبور اور اناتھ
اپنے اور پرائے سب نے
چھوڑ دیا تھا میرا ساتھ
آڑے وقتوں میں کام آئے
میرے پیارے دونوں ہاتھ

آنکھیں پھیر چکے تھے بھائی
دور کھڑے تھے رشتے دار
طعنے دیتے تھے ہمسائے
کیا ایثار کہاں کا پیار
آڑے وقتوں میں کام آئے
میرے پیارے دونوں ہاتھ

اپنی جیبیں چھپا رہے تھے
پیسے بچا رہے تھے یار
کرتے تھے انمول نصیحت
یا مجبوری کا اظہار
آڑے وقتوں میں کام آئے
میرے پیارے دونوں ہاتھ

صرف اپنے اللہ سے مانگو
مشکل پڑنے پر امداد
بچو کبھی سہارا دے گی
نظم ہماری کرلو یاد
ہر مشکل میں کام آئیں گے
اپنے پیارے! دونوں ہاتھ

Muzaffar Hanfi
D-40, Batla House
New Delhi - 110025

احرار حسین

نوبل انعام

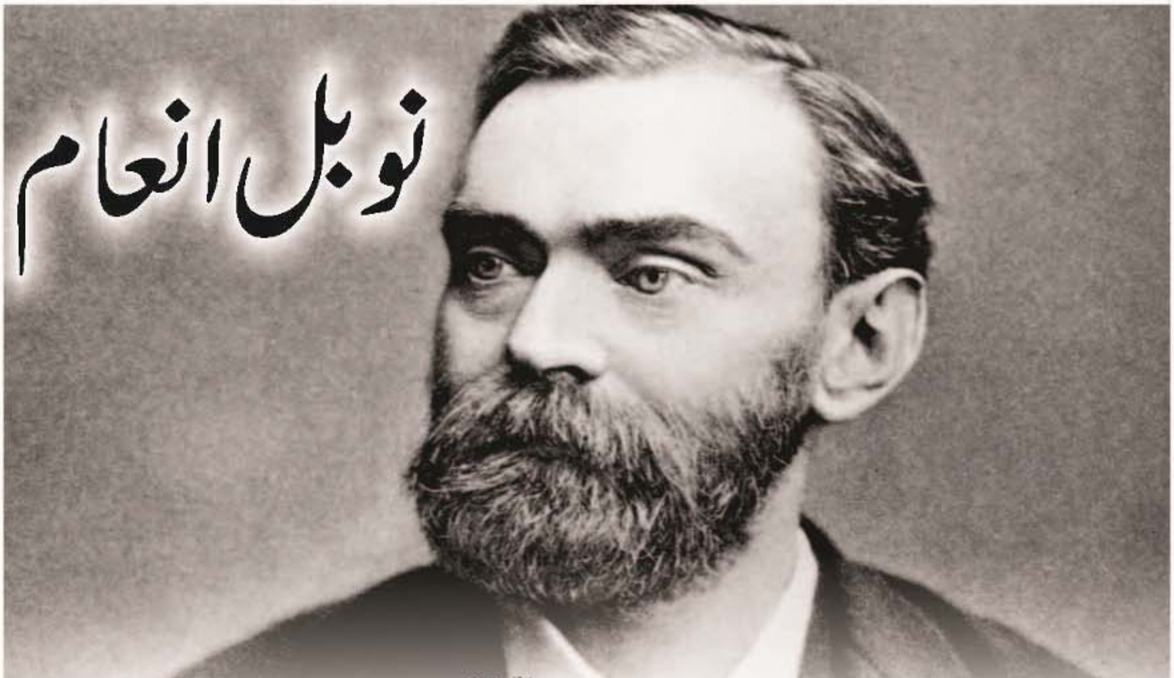

نوبیل انعام دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ جو ہر سال ماہ اکتوبر میں دنیا کے عظیم انسانوں کو ان کی عظیم خدمات کے صلے میں دیا جاتا ہے۔ یہ انعام علم طبیعیات (Physics)، علم کیمیا (Chemitry)، علم اجسام وادویہ (Physiology & Medicine)، علم معاشیات (Economics)، علم ادب (Literature) اور امن کے میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے لیے مخصوص ہے۔

نوبیل انعام کے بانی الفریڈ برن ہارڈ نوبیل سویڈن کے رہنے والے تھے جنھوں نے 1866 میں ڈائنامائٹ کی ایجاد کی تھی۔اس کے علاوہ بغیر دھوئیں کا پاؤڈر بیلسٹائٹ (Bellistite)، بلسٹائن جلیٹن (Bellistine Gelatine)، نائٹروسیلولوس (Nitrocellulose) اور مصنوعی گٹا پارچہ (Artificial Gata Parcha) کی بھی دریافت کی تھی۔

الفریڈ نوبیل کی پیدائش 21 اکتوبر 1833 کو اسٹاک ہوم سویڈن میں ہوئی تھی۔ نوبیل کے والد ایمونیل نوبیل خود بھی ایک عظیم محقق تھے۔ وہ روس میں سب میرین سائنس اور ٹورپی ڈائز بنانے کا کام کیا کرتے تھے۔اس کے علاوہ وہ دھماکے کے لیے گولہ بارود بھی تیار کرتے تھے۔

1842 میں نوبیل کے والد ان کو سینٹ پٹرس برگ (لینن گریڈ) روس لے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے نوبیل کو امریکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ امریکہ میں نوبیل نے انجینئرنگ کی تعلیم جون ارکسن کی نگرانی میں مکمل کی۔ جون ارکسن اپنے وقت کے مشہور آیرن کلیٹ نیول ویسل مانیٹر کے مانے جاتے تھے۔ امریکہ سے تعلیم کی فراغت کے بعد نوبیل روس واپس لوٹ آئے اور وہاں انھوں نے اپنی انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کو جاری رکھا۔ 1859 میں الفریڈ نوبیل اور ان کے والد سویڈن واپس آگئے۔ وطن آکر نوبیل اور ان کے والد نے آیرن برگ میں ایک کیمیکل پلانٹ لگایا اور نائٹرو گلسیرین بنانے لگے۔ اتفاقاً اس پلانٹ میں کسی وجہ سے ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا جس میں نوبیل کے بھائی کی موت واقع

ہوئی اوران کے والد بھی زخمی ہو گئے۔

1866 میں نوبیل نے ڈائنامائٹ کی ایجاد کی لیکن اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں دھماکے ہوئے جس کی بنا پر حکومت نے ڈائنامائٹ کی منتقلی پر پابندی عائد کردی۔ ان ہی ایام میں نوبیل نے نائٹروگلیسرین کی ملی جلی شکل تیار کرلی۔ جو مذکورہ خطرے سے مبرا تھی۔ اس کو بے خطرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاسکتا تھا۔ اس دھماکہ خیز مادے کا استعمال نہر کی تعمیر، چٹانوں کے توڑنے اور کھانوں کی کھدائی کے کاموں میں آتا تھا۔ نوبیل کو اس کی تجارت میں زبردست کامیابی ملی اور انھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں بے پناہ دولت اور شہرت حاصل کرلی۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ الفریڈ نوبیل اپنے وقت کے دنیا کے امیر ترین لوگوں میں گنے جاتے تھے۔ نوبیل کو سیاحی کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے ان کا بیشتر وقت سویڈن سے باہر یوروپ کے ممالک میں گزرتا تھا۔ ایک مرتبہ اخباروں میں نوبیل کی موت کی خبر غلطی سے چھپ گئی جس میں نوبیل پر نکتہ چینی بھی کی گئی تھی۔ اخبار والوں نے لکھا کہ الفریڈ نوبیل کا سب سے بڑا کام ایسے کیمیائی مادّے کی ایجاد ہے جو دنیا کو تباہ کرسکتا ہے۔ الفریڈ نوبیل کو ان بیانوں سے دھکا لگا اور انتہائی دکھ ہوا۔ الفریڈ نے اسی وقت یہ طے کیا کہ وہ ان کیمیائی کارخانوں کو بند کردیں گے اور جو کچھ بھی ان کارخانوں سے انھوں نے کمایا ہے اس کا استعمال عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کریں گے۔

مرنے سے ایک سال قبل 1895 میں نوبیل نے تاریخی وصیت نامہ لکھا جس میں انھوں نے اپنی دولت کو محفوظ کر کے حاصل نفع کو ہر سال علم طبعیات، علم کیمیا، علم اجسام وادویہ ادب اور امن کے میدان میں انعام دیے جانے کی وصیت کی۔ تقریباً 9000000 پونڈ کی رقم نوبیل نے اس عظیم مقصد کے لیے وقف کی تھی۔ 1966 میں سویڈش نیشنل بنک نے چھٹا نوبیل انعام علم معاشیات کے لیے مقرر کیا۔ اس طرح ہر سال ماہ اکتوبر میں یہ اعزازات دیے جاتے ہیں۔ نوبیل کے وصیت نامے میں ان اداروں کے بارے میں بھی ہدایات ہیں جنھیں مختلف اعزازوں کے لیے امیدواروں کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ یہ ادارے مندرجہ ذیل ہیں:

(1) علم طبعیات اور علم کیمیا کے انعامات کے لیے روائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز (اسٹاک ہوم سویڈن)

(2) علم اجسام وادویہ کے انعام کے لیے رائل لیکورن انسٹی ٹیوٹ سویڈن

(3) ادب کے انعام کے لیے سویڈش اکیڈمک سویڈن

(4) امن کے انعام کے لیے نوبیل کمیٹی آف دی ناروے ین اسٹارٹنگ پارلیمنٹ

(5) علم معاشیات کے انعام کے لیے رائل سویڈش اکیڈمی آف سائنسز سویڈن

ان انعاموں کو حاصل کرنے کے لیے امیدواروں کو خود درخواست دینا نہیں ہوتی ہے بلکہ سالِ رواں کے اہم کام کرنے والوں کے ناموں کی منظوری بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیات، نوبیل انعام یافتہ اور مقرر انجمنیں مذکورہ اداروں کی سفارش کرتی ہیں۔

نوبل انعام پانے والوں کو سونے کے تمغے (یہ تمغہ تقریباً 23 کیرٹ سونے کا 205 دائرے کا اور آدھا پونڈ وزن کا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سند اور تقریباً 100000 پونڈ رقم نقد دی جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ اعزاز ایک سے زائد لوگوں میں بیک وقت دیا جاتا ہے۔ یہ انعامات ہر سال دسمبر کو الفریڈ نوبیل کی

یوم وفات کے موقعے پر اسٹاک ہوم سویڈن میں منعقد ایک خصوصی اجلاس میں دیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلا نوبیل انعام 1901 میں منظور ہوا جو اگلے سال دیا گیا تھا۔

1901 سے 1993 تک کے وقفے میں علم طبیعیات کے میدان میں 144 سائنسدانوں کو 87 نوبیل انعام، علم کیمیا میں، سائنسدانوں کو، 85 نوبیل انعام ادب کے میدان میں، 90 ادیبوں کو، 86 نوبل انعام امن کے لیے 960 لوگوں کو 86 نوبیل انعام اور علم معاشیات کے لیے 34 لوگوں کو 25 نوبیل انعاموں سے نوازا جاچکا ہے۔ اگر ہم 1901 سے 1993 تک دیے گئے نوبیل انعاموں پر نظر ڈالیں تو یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نوبیل فاؤنڈیشن نے انعامات کو بانٹنے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ بہت سے سائنسدانوں، ادیبوں اور امن کے خیرخواہوں کو نظرانداز بھی کیا ہے۔ ان میں مہاتما گاندھی لیوٹالسٹائے، ایلورڈ ہوول، علامہ اقبال اور پریم چند خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ایک اور شکایت یہ ہے کہ نوبیل انعامات بہت دیر سے دیے جاتے ہیں۔ یعنی کسی بھی اہم کام یا ایجاد کے کئی سال بعد اس کو انعام کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نوبیل انعاموں کے لیے سفارشات زیادہ تر امریکن یا ان کے دوست ملکوں کو ہی یہ انعام مل پاتا ہے اور اس وجہ سے دوسرے ملکوں کے سائنسدانوں کو محرومی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اب یہ کہنا ضروری ہوگیا ہے کہ نوبیل انعام دینے کے طریقے کو اب از سرِ نو تشکیل دیا جائے تاکہ دنیا کے سب ہی ممالک اور افراد بغیر تفریق اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ہندوستانی یا ہندوستان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے نام اس طرح ہیں جنھوں نے نوبل انعام حاصل کیا:

- مدر ٹریسا (پیدائش 1910 انعام برائے امن 1979)
- رابندر ناتھ ٹیگور (پیدائش 1851، وفات 1941 انعام برائے ادب)
- سبرامینن چندر شیکھر (پیدائش 1910 انعام برائے طبیعیات 1983)
- س۔وی رمن (پیدائش 1888، وفات 1975 انعام برائے طبیعیات 1913
- ہرگوبند کھورانہ (پیدائش 1922 انعام برائے علم ادویہ (1968

دنیا کا یہ عظیم اعزاز کرہِ ارض کے عظیم سائنس دانوں کی عظیم خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے۔ اگر ہم انعام یافتہ سائنسدانوں کی زندگی کے اوراق کو پلٹ کر دیکھیں تو ہمیں احساس ہوگا کہ ان کی زندگی کا ہر لمحہ تلاش و جستجو اور ایجاد و اختراع میں گزرا ہے۔ انسانی فلاح و بہبود اور امن و امان ان کے پیش نظر رہا ہے۔ ان سائنسدانوں نے اپنے تحقیقی کاموں میں اپنا خونِ جگر صرف کر کے بنی نوع انسان کو ترقی کی منزلوں سے ہم کنار کیا ہے۔ اسے نئی راہیں دکھائی ہیں اور نئے افق کی نشان دہی کی ہے۔ اسی بنا پر باشعور ابنِ آدم کی نظریں سالِ نو کی آمد پر ان سائنسدانوں پر مرکوز ہوجایا کرتی ہیں جو اس کے مستحق ہوتے ہیں۔

■

ماخذ: سائنسی شعاعیں، مصنف: ڈاکٹر احرار حسین، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

شاہد ساگری

رونقِ بزمِ جہاں بچوں سے ہے

رونقِ بزمِ جہاں بچوں سے ہے — یہ زمیں جنّت نشاں بچوں سے ہے
پھول کی صورت کھلے ہیں ہر طرف — باغباں یہ گلستاں بچّوں سے ہے
ان بزرگوں کی زبانی اب کہاں — اب تو ہر اک داستاں بچّوں سے ہے
جس طرف بھی دیکھیے اک بھیڑ ہے — زندگی کا کارواں بچّوں سے ہے
لہلہاتے ہیں یہ پھولوں کی طرح — رنگ، خوشبو، گلستاں، بچّوں سے ہے
بغض و کینہ دل میں یہ رکھتے نہیں — ہر طرف امن و اماں بچّوں سے ہے
ہے شکایت اور شکوے بے شمار — پھر بھی یہ گھر شادماں بچّوں سے ہے
ان کے دم سے دل نشیں ہے کائنات — شور و غل، امن و اماں بچّوں سے ہے
جگمگاتے ہیں ستاروں کی طرح — یہ زمیں اب آسماں بچوں سے ہے
جو بزرگوں سے وراثت میں ملی — ہاں وہی اردو زباں بچّوں سے ہے

Shahid Sagri
13/2, Arif Nagar,
Bhopal - 38 (MP)

مسرت جہاں

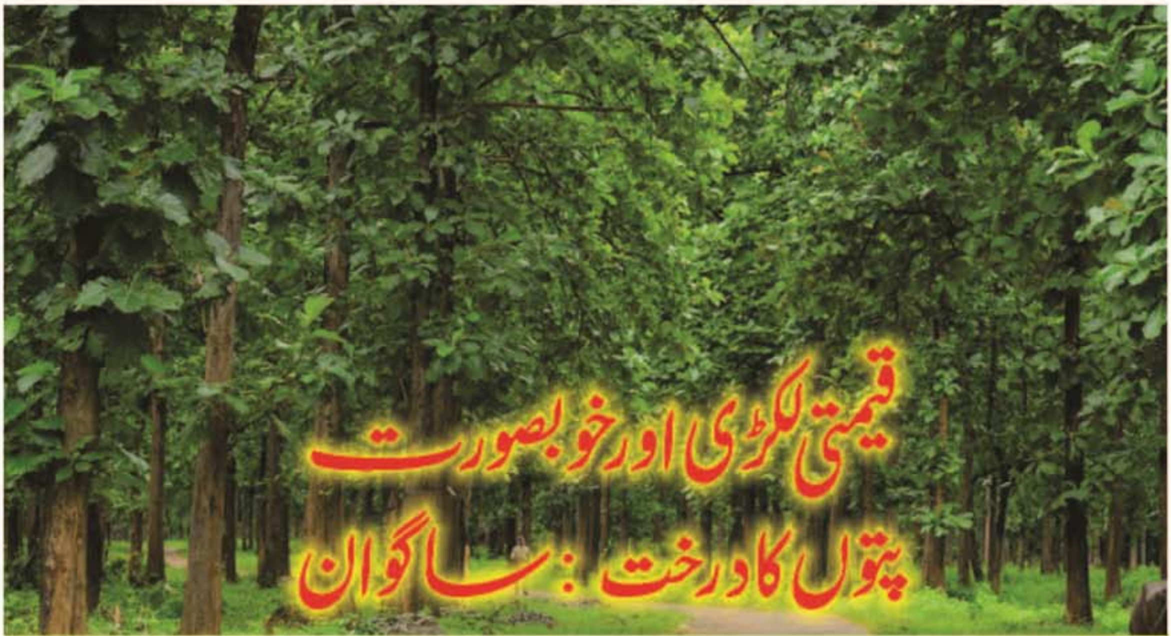

قیمتی لکڑی اور خوبصورت پتوں کا درخت : ساگوان

سکندر اعظم اور ہندوستان کے بادشاہ پورس کے درمیان خونریز جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس جنگ میں سکندر اعظم کو فتح حاصل ہوئی۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ مزید آگے بڑھے لیکن اُس کی فوج مزید آگے بڑھنے پر آمادہ نہ تھی۔ فوجیوں کو اپنا گھر بار چھوڑے تقریباً سات سال گزر چکے تھے اور ان کو اپنے گھر کی یاد ستا رہی تھی۔ وہ مزید جنگ کرنے سے عاجز آ چکے تھے۔ ایسی حالت میں سکندر واپس لوٹ جانے پر مجبور تھا۔ اُس نے 2000 کشتیوں کا ایک سمندری بیڑہ تیار کرایا اور اپنے تھکے ماندے فوجیوں کو سندھ کے دہانے سے خلیج فارس کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ کشتیاں ساگوان کی بنی ہوئی تھیں۔

انگلستان کے لوگ ہمارے ملک میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے تاکہ ہمارا مال خرید سکیں اور اپنا مال یہاں فروخت کر سکیں۔ وہ سورت، بمبئی، کلکتہ اور مدراس جیسے ساحلی مقامات پر بس گئے۔ ان کے پاس تجارت کے لیے کچھ جہاز تھے۔ فرانس کے لوگ بھی ہمارے ملک میں اسی مقصد سے آئے تھے۔ اکثر فرانسیسیوں، انگریزوں اور مقامی حکمرانوں کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ دوسری اقوام کے مقابلے میں انگریزوں کو جہازرانی کا زیادہ تجربہ تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ جہازوں کا ایک اچھا بیڑا تجارت اور جنگ میں کتنا کارگر ثابت ہوتا ہے۔

بمبئی میں ان کی اپنی ایک گودی (Dockyard) بھی تھی جہاں پرانے جہازوں کی مرمت ہوتی تھی اور نئے جہاز بنائے جاتے تھے۔ اُن کو جہاز بنانے کے لیے مناسب عمارتی لکڑی کی ضرورت تھی۔ کنارا اور مالابار کے جنگلات میں اُگنے والے ساگوان کے جنگلات نے ان کی اس ضرورت کو بآسانی پورا کر دیا۔ اس لیے 1736 میں ایک بڑا جنگی جہاز تیار کیا گیا جس کا نام ڈریک رکھا گیا۔ اس پر توپیں نصب کی گئیں یہ پہلا جنگی جہاز تھا جو سمندر میں اتارا گیا۔ اس طرح انگلستان کے جہاز بنانے والوں کو ساگوان کے استعمال کا علم ہو گیا۔ ان کو اندازہ ہو گیا کہ یہ دنیا کی بہترین لکڑی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی اپنی

جاتی پیچانی شاہ بلوط کی لکڑی سے بھی بدرجہا بہتر ہے۔ چنانچہ انھوں نے مزید جہاز بنانے کے منصوبے تیار کیے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اَن گنت درختوں کو کاٹ ڈالا۔ بمبئ میں اب کافی تعداد میں جہاز بننے لگے اور ان کو ایک کے بعد ایک سمندر میں اتارا جانے لگا۔ 1805 میں جارج سوئم کی بحری فوج کے لیے ایک تیز چلنے والا جہاز مکمل طور پر ساگوان سے بنایا گیا۔ اس پر 36 توپیں نصب کی گئی تھیں۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا، جب تک کہ جہاز بنانے والوں کے سامنے مستقل میں ساگوان کی دستیابی کا مسئلہ درپیش نہ آیا۔

مالابار میں ایک کلکٹر تھے جن کا نام ایچ- وی کونولی تھا۔ وہ ایک دوراندیش آدمی تھے۔ اُن کو یہ اندیشہ تھا کہ کچھ عرصے کے بعد جنگلات میں ساگوان باقی نہیں رہے گی۔ انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان دنوں ایک جہاز بنانے کے لیے پختہ لکڑی کے تقریباً 2000 درخت درکار ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ساگوان ان کو پختگی کے اس درجے تک پہنچنے کے لیے کم سے کم 60 سال کا عرصہ لگتا ہے۔ یہ عرصہ گزرنے کے بعد ہی یہ جنگل کاٹے جاسکتے ہیں اور جو جنگل اگلے سال لگایا جائے اُس کو 61 ویں سال میں کاٹا جاسکتا ہے اور آئندہ سال ان پیڑوں کو کاٹا جاسکتا ہے جو تیسرے سال لگائے گئے تھے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

اُس زمانے میں ساگوان کے جنگل لگانے کا کسی کو بھی تجربہ نہیں تھا۔ کونولی خود بھی کوئی تربیت یافتہ جنگلات کے ماہر نہ تھے لیکن اُس کا رجحان اس طرف ضرور تھا۔ بیجوں سے نکلے ہوئے پودوں کی مدد سے اس نے جنگل اگانے کی کوشش کی لیکن تین سال تک اس کو کوئی خاص کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ بالآخر اس کے دفتر میں کام کرنے والے ایک کلرک نے ایک طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ اُس کے اس کام میں مدراس کا گورنر بھی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے کلکٹر کو چھتو مینن نامی ایک مقامی ماہر جنگلات کی خدمات فراہم کردیں۔ کونولی نے مینن کی مدد سے 1844 میں ہندوستان کا پہلا ساگوان کا شجر زار کیرالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں نیلمبور کے نزدیک لگوایا تھا۔ چھتو مینن 18 سال تک اپنے اس قابل تعریف کام میں جٹا رہا اور اس نے تقریباً 600 ہیکٹیئر زمین پر جنگلات لگوائے۔ اگرچہ اس کام میں اس کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے کبھی بھی ہمت نہیں ہاری۔ اُس کے کام کی بہت تعریف کی گئی اور اسے اپنی قابل تعریف خدمات کے صلے میں ایک خوبصورت آرائشی درانتی اور ایک پٹی بطورِ انعام پیش کی گئیں۔ ریٹائر ہونے پر اس کو ایک اعزازی پنشن بھی دی گئی۔

کونولی ایک غیر معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی تھا اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اُس نے ہر ممکن کوشش کی۔ 1846 میں ایک دریا کے کنارے پر لگے ہوئے جنگل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا گیے۔

کونولی ایک غیر معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی تھا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اُس نے ہر ممکن کوشش کی۔ 1846 میں ایک دریا کے کنارے پر لگے ہوئے جنگل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کی یادگار کے طور پر محفوظ رکھا گیا ہے۔ اگر آپ کا نیلمبور

جانے کا اتفاق ہوتو براہِ کرم اس جنگل کو ضرور دیکھیں۔

125 سال پرانے ان درختوں کو دیکھ کر ہم آج بھی متاثر ہوتے ہیں۔ وہ آج بھی لمبے چوڑے ستونوں کی مانند کھڑے ہیں اور اپنے اولین محسنوں کی تعریف میں گیت گاتے رہتے ہیں۔

نیلمبور کی اس شاندار کامیابی کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی شوق پیدا ہوا اور پہلی بار 1856 میں برما میں، ٹراونکور میں 1866 میں اور کورگ میں 1868 میں ساگوان کے جنگل لگائے گئے۔ ساگوان کی اس دلچسپ کہانی کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک میں سائنٹفک جنگل بانی کی تاریخ بھی شروع ہوتی ہے۔ اسی وقت سے جنگل کو ایک جاندار چیز سمجھا جاتا ہے جو ہم سے بہت زیادہ مختلف نہیں اور جسے ہماری توجہ اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم جنگل کا استعمال ہوشمندی سے کریں تو ہم کو اس سے ہمیشہ اپنی من پسند لکڑی حاصل ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو انسان ایک دن اپنا ایک قدیم ترین اور قوی دوست کھودے گا، چاہے وہ بظاہر کتنی ہی افراط میں کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

ساگوان کے قدرتی جنگلات اور شجرزار

ساگوان ہندوستان، برما، تھائی لینڈ، جاوا اور ملایا کا مقامی درخت ہے۔ یہ ہندوستان کے پت جھڑ والے جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ ملک کے آدھے سے زیادہ ساگوان کے جنگلات مدھیہ پردیش میں پائے جاتے ہیں۔ راجستھان، گجرات، مہاراشٹر، میسور (کرناٹک)، آندھرا پردیش، کیرالہ اور تامل ناڈو دوسری ریاستیں ہیں جہاں ساگوان کے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر خصوصاً کیرالہ میں ساگوان کے بلند و بالا اور دیو پیکر درخت اُگتے ہیں۔

پرانے زمانے میں لوگ جنگلات لگانے کے مخصوص طریقوں سے ناواقف تھے۔ ساگوان کے بیج جنگل میں بو دیے جاتے تھے اور باقی کام قدرت پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا تھا کہ تھوڑے سے درخت اِدھر اُدھر اُگ آتے تھے۔ دوسری طرف جنگل بان بہتر طریقے اپنا کر زیادہ درخت اگانا چاہتا تھا۔ اس نے زرخیز زمین کے کچھ ٹکڑوں کا انتخاب کیا اور وہاں اگنے والی گھاس اکھاڑ کر اس کو جلا دیا۔ جلی ہوئی گھاس کی راکھ زمین کے اُن حصوں پر بکھیر دی گئی اور پھر اس میں بیج بو دیے گئے۔ یہ طریقہ کامیاب تو ضرور ہوا لیکن پھر بھی اس میں کچھ دشواریاں پیش آئیں۔

درخت لگانے کا جدید طریقہ قلم لگانا ہے۔ درختوں کی

قلمیں لمبے سگار کی مانند ہوتی ہیں۔ اُن کو اس طرح تیار کیا جاتا ہے کہ ایک سال کے پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر دوبار کاٹا جاتا ہے۔ 25 سینٹی میٹر کا جڑ کی طرف کا ٹکڑا اور 2 سینٹی میٹر کو تپل کی طرف کا حصہ جوڑ کر قلم بنائی جاتی ہے۔ جنگل لگانے کے لیے اس طرح کی ہزاروں قلمیں تیار کی جاتی ہیں۔ اس طرح پیڑ لگانے کے لیے گڑھوں کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ گدالے کی مدد سے دو دو میٹر کی دوری پر زمین میں چھید کر دیے جاتے ہیں اور ہر چھید میں ایک قلم لگا دی جاتی ہے اور چھیدوں کو نرم اور نم مٹی سے بھر دیا جاتا ہے۔ چند دنوں بعد قلم کے اوپری حصے پر چھوٹی چھوٹی پتیاں نکل آتی ہیں اور پھر یہ پودے جلد ہی آدمی کے قد کے برابر ہو جاتے ہیں۔

شجر زار کو گھاس پھوس سے کم سے کم دو تین سال بالکل صاف رکھا جاتا ہے۔ ایسے شجر زار میں چند بار کانٹ چھانٹ بھی کی جاتی ہے۔ 80 سال کے عرصے میں درخت کاٹنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

خوبیوں والی لکڑی- ساگوان

ساگوان میں بے شمار خوبیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ لکڑی مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہلکی بھی ہوتی ہے۔ یہ دنیا کی پائیدار ترین عمارتی لکڑیوں میں سے ایک ہے۔ دیمک اور پھپھوندی بھی اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ یہ پانی میں لمبے عرصے پڑے رہنے کے باوجود خراب نہیں ہوتی۔ ساگوان سے بنی چیزیں ہمیشہ اپنی اصل شکل میں رہتی ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ یہ لکڑی جہاز کی گودیوں اور دوسرے ساز و سامان بنانے کے لیے سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اگر چہ اب جہاز سازی میں فولاد کا استعمال ہونے لگا ہے لیکن جہاز کے ڈھانچے کے علاوہ اس کی کئی چیزیں ساگوان ہی سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ لکڑی آنکھوں کو لبھانے والی، خوبصورت اور گہرے پیلے یا کتھئی رنگ کی ہوتی ہے جس پر خوبصورت دھاریاں بنی ہوتی ہیں۔ سجاوٹی پلائی وڈ بنانے میں بھی اس لکڑی کی کافی مانگ ہے۔ ایک بڑھئی کے لیے اس لکڑی سے کئی قسم کی استعمال میں آنے والی چیزیں بنانا بھی بہت آسان ہے۔ اس سے بنا ہوا فرنیچر نہایت چمکدار ہوتا ہے اور اسی لیے فرنیچر بنانے کے لیے یہ بہترین لکڑی مانی جاتی ہے۔ گھر کا کوئی بھی حصہ ساگوان سے بنایا جا سکتا ہے۔ برما میں ساگوان اس قدر افراط سے ملتی ہے کہ وہاں زمین کا فرش اور چھت بنانے میں اس لکڑی کا استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ رنگوں کی کچھ سڑکیں ساگوان کے تختوں سے بنی ہوئی ہیں۔ ساگوان کے شہتیر عرصۂ دراز تک مضبوط رہتے ہیں۔ پرانی ہولکر ریاست کے شہر شنڈوا (Shendwa) کے قلعے میں 700 سال پرانا ساگوان کا شہتیر آج بھی صحیح و سالم ہے۔ برما کے مندروں اور خانقاہوں میں ساگوان کے خوبصورت نقش و نگار بنانا ایک عام فن ہے۔

ساگوان کا استعمال بڑے بڑے پل اور ستون بنانے میں بھی کیا جاتا ہے۔ گاڑیاں اور ریل کے ڈبے بنانے میں اس لکڑی کا عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اس سے پل بنانے کے علاوہ اس کا استعمال رائفلوں کے بکس اور گولہ بارود رکھنے کے ڈبے جیسے سامان بنانے میں بھی ہوتا تھا۔

■

ماخذ: جنگلات کی کاشت (انسان ساختہ جنگلات)،
مصنف: ایس کونداس، مترجم: مسرت جہاں،
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

افتخار انیس صدیقی

غلط فہمی

کردار

آصف: کہانی کار (عمر 50 سال)

ہنی: بہت موٹا لڑکا (عمر 14 سال ہے)

کرشن: ہنی کا ہم عمر دوست

راشد: ہنی سے بھی زیادہ موٹا اور ہم عمر دوست

سائرہ: ہنی کی ہم جماعت

فرحت: ہنی کی ہم جماعت

سردار: ہنی کا ہم جماعت

(پردہ اُٹھتا ہے۔ اسٹیج کے درمیان کمرے میں بہت قرینے سے صوفہ سیٹ ایک میز کرسی لگی ہوئی ہے۔ آصف ایک کرسی میز پر بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ ان کے پاس کچھ کتابیں، قلم وغیرہ اور کافی سامان پھیلا ہوا ہے۔ لکھنے میں وہ کچھ زیادہ ہی مشغول ہیں۔ اچانک دروازے سے ہنی کمرے میں داخل ہوتا ہے۔)

ہنی: (آصف سے مخاطب ہو کر) آداب انکل

آصف: (ہنی سے) آداب بھئی! کہو کیسے ہو؟ کیسے آنا ہوا؟

ہنی: (شکایت بھرے لہجے میں) انکل جو آپ نے میرے بارے میں کہانی شائع کرائی ہے، اس سے مجھے بہت تکلیف ہے۔ لڑکے مجھ پر ہنستے ہیں۔

آصف: اچھا! کیا تم نے وہ کہانی پڑھی ہے؟

ہنی: نہیں

آصف: تو پھر؟

ہنی: (ہکلاتے ہوئے) وہ.....وہ.....وہ یہ بات میں نے کرشن سے سنی تھی۔

آصف: کیا کرشن نے پڑھی ہے؟

ہنی: معلوم نہیں۔

آصف: کیا تم کرشن کو ابھی بلا کر لا سکتے ہو؟

ہنی: کیوں نہیں۔

(ہنی باہر چلا جاتا ہے اور آصف دوبارہ اپنے لکھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہنی کرشن کو لے کر کمرے میں داخل ہوتا ہے)

کرشن: آداب انکل۔

آصف: ہوں! کیا تم نے میرے کہانی پڑھی ہے؟

کرشن: نہیں۔ میں نے آپ کی کہانی نہیں پڑھی ہے۔ مجھے تو راشد نے بتایا۔ آپ کی وہ کہانی ہنی پر ہو بہو ہے۔ آپ راشد سے پوچھ سکتے ہیں۔

آصف: تو جاؤ! جلدی سے راشد کو بھی بلا کر لے آؤ۔

(کرشن کمرے سے باہر چلا جاتا ہے اور تھوڑی دیر میں راشد کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔)

راشد: آداب انکل

آصف: تم نے میرے کہانی پڑھی ہے یا تم کو بھی کسی اور نے سنائی ہے۔

راشد: (ڈرتے ڈرتے) میں نے آپ کی کہانی نہیں پڑھی۔ مجھے تو فرحت نے بتایا کہ پچھلے مہینے 'کھلونا' میں ایک کہانی شائع ہوئی تھی جس کا ہیرو ہنی کی طرح موٹا و مسخرہ تھا۔

آصف: پھر تو فرحت بھی آنی چاہیے۔ چلو اس کو بھی بلا لاؤ۔

(راشد جاتا ہے..... اور فرحت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔)

فرحت: (سب کو ہوں ہا جمع دیکھ کر) کیا بات! آج آپ سبھی یہاں کیسے جمع ہیں؟

آصف: یہ سب میری کہانی جو پچھلے مہینے 'کھلونا' میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی شکایت کرنے کے لیے میرے پاس جمع ہیں۔

فرحت: اوہ! بات اب سمجھ میں آئی وہ کہانی تو میں نے بھی نہیں پڑھی، مجھے تو سائرہ نے بتایا تھا۔

آصف: ارے اس کا مطلب یہ ہو کہ اتنی ساری فوج صرف ایک سے دوسرے تک افواہ ہی پھیلاتی رہی اور ان میں سے کسی نے بھی کہانی نہیں پڑھی۔

فرحت: نہیں انکل یہ بات نہیں۔ مجھے تو پچھلے مہینے کا ''کھلونا'' ملا ہی نہیں۔ سائرہ کوئی چھوٹی بچی تو نہیں۔

آصف: جاؤ! اور سائرہ کو ابھی بلا کر لاؤ۔

(راشد جاتا ہے..... اور سائرہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ان کے ساتھ سردار بھی ہے۔)

آصف: (سائرہ سے) تم نے پڑھی میری کہانی؟

سائرہ: سائرہ! جی میں نے پڑھی۔ وہ کہانی اصل میں سردار پر پوری اُترتی ہے۔

(آصف سے) جی انکل سائرہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کہانی میں نے بھی پڑھی ہے۔ کہانی کا ہیرو میری طرح موٹا مسخرہ اور ہنسوڑ ہے۔ ہنی مجھ سے کم موٹا ہے اور وہ بات بات پر غصہ بھی دکھاتا ہے۔ اگر اُس ہیرو کا نام سردار ہوتا تو اور بھی مزہ آجاتا۔ ہنی کو تو غلط فہمی ہے۔ اب کی بار میرے نام سے ہی کہانی لکھئے گا۔

(سبھی بچے ہنی کو دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر لے جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے)

■

Dr. Iftekhar Anees Siddiqui
196, Chilla
Amroha - 244221 (UP)

■ متین اچل پوری

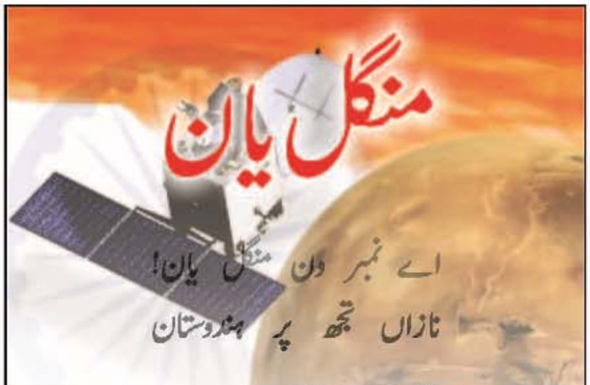

منگل یان

اے نمبر ون منگل یان!
نازاں تجھ پر ہندوستان

آنکھ کو حاصل تیرے سبب
تصویریں منگل کی عجب

مارس بھی اور مریخ بھی نام
گردش کرنا اس کا کام

منگل کیا ہے جسم ہے ایک
سیارے کی قسم ہے ایک

پتھریلی، سنسان زمیں
داغ کہیں ، بے داغ کہیں

تو اول دن سے تا حال
بھیج رہا ہے حال احوال

فطرت کے رازوں کو کھول
گہری دُھند میں روشنی گھول

بے شک زریں باب ہے تو
سائنسی سرخاب ہے تو

■

Mateen Achalpuri
Biyabani, Achalpur - 444806
Distt.: Amravati (Maharashtra)

■ رفیق گلاب

آؤ بچو! کریں ڈرامہ

علم و فن کا ہے یہ زمانہ
آؤ بچو! کریں ڈرامہ

پڑھو لکھو تم علم بڑھاؤ
اچھے اچھے فن اپناؤ

جو بھی ڈرامہ پیش کرو تم
اچھی باتیں پیش کرو تم

ڈائیلاگ بھی ٹھیک ادا ہو
پڑھنے کا انداز جدا ہو

اچھا سا تم کرلو میک اَپ
بنو ڈاکٹر کرلو چیک اَپ

جو بھی تم کردار نبھاؤ
اس کو اک شہکار بناؤ

ایک اچھا فنکار بنو تم
جگ میں اپنا نام کرو تم

■

Rafeeque Gulab
3-C, 102, Sarvodaya Park, Kalyan (West)
Thane - 421301 (Maharashtra)

نسیم سعید

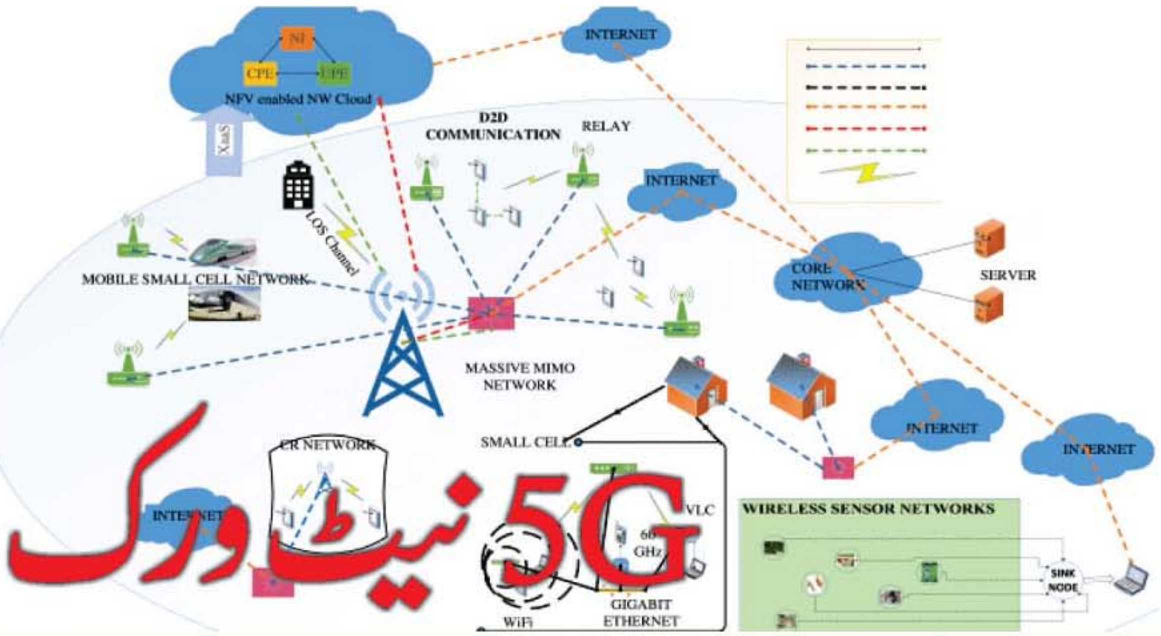

5G نیٹ ورک

ہم ہندوستانیوں کے لیے موجودہ زمانہ جدید ترین تکنیک سے لبریز ذرائع نشر واشاعت وابلاغ کا ہے۔ ہم جدید ترقی کے لحاظ سے اس سلسلے میں موجودہ زمانے کے شانہ بہ شانہ چل رہے ہیں۔ ہم جدید ترین ٹیکنالوجی میں کافی آگے نکل گئے ممالک سے مقابلہ کررہے ہیں اور اپنی طاقت کا لوہا منوا کر اپنی بہترین صلاحیت کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ یقیناً ہم ملک کی موبائل صنعت میں ان دنوں 4G نیٹ ورک کے سلسلے میں دوسروں پر سبقت لے چکے ہیں۔ ہر موبائل نیٹ ورک فراہم کردہ کمپنی 4G نیٹ ورک کے نام پر گراہکوں کو اپنے خیمے میں بنائے رکھنے کے ساتھ ہی دوسری کمپنیوں کے گراہکوں کو اپنی طرف لانے کی ہر ممکن کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ ان حالات میں اب ہمارے ملک نے 5G موبائل نیٹ ورک کو عوام کی خاطر اتارنے کی تیاریوں کا آغاز کردیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ موبائل نیٹ ورک کی پانچویں نسل یعنی 5G اور وائرلیس نظام اب ہندوستانی عوام کی پکڑ سے دور نہیں ہے۔ یہ دعویٰ بھی اب سچ ثابت ہونے کے لیے دور نہیں کہ جس طرح آج ہر ہندوستانی کے ہاتھ میں موبائل ہے، بالکل اسی طرح سال 2020 تک ہر ہندوستانی کے ہاتھ میں 5G نیٹ ورک والی خدمات میسر ہوں گی۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ 4G کے مقابلے میں 5G کی یہ خدمات دس گنا زیادہ رفتار دینے کے ساتھ توانائی کی بھی کفالت کریں گی۔ مطلب صاف ہے کہ 5G کا نیٹ ورک 4G کے مقابلے میں دس گنا تیزی سے ڈاٹا منتقل کرسکے گا۔

اگر یہ تکنیک ہندوستان میں جلد ہی اپنا قدم مضبوط کرتی ہے تو عوام کو کافی فائدہ ممکن ہے جیسے ایک سیکنڈ کے اندر ہی High definition فلم ڈاؤن لوڈ ہوجائے گی۔ سال 2020 میں سارے عالم میں 5G نیٹ ورک لانے کا عملی منصوبہ زیر غور ہے لیکن چین نے ہم سب سے آگے نکلتے ہوئے اس کی مشق بھی شروع کردی ہے۔ آج چین کے زیادہ تر شہروں میں 5G ٹیکنالوجی کے ذرائع ابلاغ کے آلات پر عمل درآمد شروع ہوگیا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں انٹرنیٹ خدمات کے

استعمال میں تاخیر ہوئی ہے۔ اب بھی ہمارے یہاں 4G انٹرنیٹ ورک ٹھیک سے اپنی خدمات انجام نہیں دے پاتا ہے مگر پھر بھی دوسرے ممالک کے مقابلے ہم کافی آگے ہیں۔ 5G کے معاملے میں ایسی امید ہے کہ یہ ہمیں دنیا کے باقی ممالک کے ساتھ ہی فراہم ہوسکتا ہے۔

نیٹ ورک کی تاریخ پر غور کریں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہمیں 2G ترقی یافتہ ممالک سے تقریباً پچیس سال بعد دستیاب ہوا تھا جب کہ ہمیں 3G امریکہ اور یورپ کے مقابلے ایک دہائی بعد میسر ہوا۔ اسی طرح 4G عالمی شکل میں پیش کیے جانے کے پانچ برس بعد ہم تک پہنچا تھا۔ یہ ایک اچھی خبر ہے کہ جو فلم ہم 4G کے ذریعے دس منٹ میں ڈاون لوڈ کرتے ہیں، وہی اب 5G کے ذریعے ایک سیکنڈ کے اندر ڈاؤن لوڈ کرسکیں گے۔ ساتھ ہی Video Buffering سے بھی نجات 5G کے ذریعے ممکن ہے۔ 5G ایک ملی سیکنڈ سے بھی کم وقت میں ڈاٹا منتقل کرسکتا ہے۔ یہ مشین سے مشین رابطہٗ گفتگو (Communication)، اشیا کا انٹرنیٹ (Internet of things)، اسمارٹ سٹی، ریموٹ کنٹرول، سرجری سے لے کر Virtual reality جیسی خدمات کا دائرہ وسیع کرے گا۔

5G سے لوگ اپنے گھروں کو الیکٹرانکس، سافٹ ویئر یا سینسر ٹیکنالوجی سیلیس کرکے وائرلیس نیٹ ورک سے مربوط کرسکتے ہیں یعنی اس کے آنے سے گھر کا حفاظتی نظام وائرلیس نیٹ ورک کے توسط سے دور سے ہی کنٹرول میں آجائے گا۔ 5G کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ فون ہی نہیں بلکہ Wareable device، ہوم پروڈکٹ سمیت مختلف آلات سے تعاون کرے گا۔ اس سے اسمارٹ شہر، اسپتال اور آمدورفت کا نظام منسلک ہوگا۔ مستقبل قریب میں بغیر ڈرائیور والی کار میں یہ تکنیک خود طے کرے گی کہ کار میں بیٹھے شخص کو موبائل کے لیے تیز رفتار انٹرنیٹ چاہیے۔ جبکہ کار کو Navigation نظام سے منسلک کرکے رکھنے کے لیے کم رفتار تعلق چاہیے۔

معلوم ہو کہ آج جنوبی کوریا میں 4G کا اکیانوے فی صدی نیٹ ورک وقت مقررہ پر میسر رہتا ہے۔ یہ ملک نیٹ ورک کی مسلسل فراہمی کے معاملے میں آج دنیا میں اوّل ہے لیکن ایک اندازے کے مطابق سال 2020 میں 5G کے سبب تقریباً تیس ارب تکنیکی آلات انٹرنیٹ ورک سے مربوط ہوجائیں گے۔ ایسا اندازہ ہے کہ سال 2021 تک موبائل ڈاٹا ٹریفک میں آج کے مقابلے پندرہ گنا کا اضافہ ہوسکتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ دنیا کی پہلی وائرلیس ٹیلی فون تکنیک 1G کی ہے۔ یہ تکنیک پہلی بار سال 1980 میں دنیا کے سامنے آئی اور 93-1992 تک اس کا استعمال کیا جاتا رہا۔ اس میں ڈاٹا کی آمدورفت کی رفتار 2.4KBPS تھی۔ اس میں Roaming کا کوئی نظام نہیں تھا۔ یہی اس تکنیک کی سب سے بڑی خامی تھی۔ اسی طرح سال 1991 میں فن لینڈ میں 2G کی شروعات ہوئی۔ اس تکنیک میں پہلی بار ڈیجیٹل سگنل کا استعمال کیا گیا۔ یہ تکنیک خاص طور سے آواز کے اشارے کی اشاعت کرتی ہے۔ اس تکنیک سے ڈاؤن لوڈ اور اَپ لوڈ کی زیادہ سے زیادہ رفتار (KBPS-Kilo Byte per second) 236 KBPS تھی۔

3G تکنیک کا آغاز سال 2001 میں جاپان سے ہوا۔ اس تکنیک کی بدولت دنیا میں ایک نئی نشرواشاعت اور جدید ذرائع ابلاغ کے انقلاب کی شروعات ہوئی۔ اس وجہ سے موبائل فون کی جدید نسل یعنی اسمارٹ فون کو اہمیت حاصل ہوتی

چلی گئی۔اس تکنیک کی زیادہ سے زیادہ رفتار 21MBPS ہوتی ہے۔ اس تکنیک نے موبائل فون کے لیے ایپ (APP) بنانے کا راستہ کھول دیا۔

مزید معلوم ہو کہ 4G تکنیک کی شروعات بھی سال 2000 کے اختتام میں ہوئی۔اسے موبائل تکنیک کی چوتھی نسل سے بھی مخاطب کیا جاتا ہے۔اس تکنیک میں 100MBPS تک کی رفتار سے ڈاٹا کو ڈاؤن لوڈ اَپ لوڈ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تکنیک گلوبل رومنگ(Global Roaming) میں معاون ثابت ہوئی ہے۔ یہ تکنیک 3G کے مقابلے زیادہ ارزاں اور سودمند ہے۔اس تکنیک سے آج ہر کوئی فائدہ اٹھا رہا ہے۔

لیکن اب اگلی نسل 5G تکنیک کو لے کر عالمی سطح پر کام شروع ہو گیا ہے۔دراصل اس تکنیک کی شروعات سال 2010 میں ہوئی تھی۔اسے موبائل نیٹ ورک کی پانچویں نسل کہا جاتا ہے۔ اس تکنیک کی بدولت Video Calling کے شعبے میں زبردست انقلاب آنے کی امید ہے۔اس تکنیک میں (1000 MBPS) 1GBPS سے زیادہ رفتار سے ڈاٹا ٹرانسفر کیا جاسکتا ہے۔حالانکہ ابھی تک اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار کو متعین نہیں کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جو آئندہ دو برسوں میں 5G نیٹ ورک کو یقینی بنانے کی سمت میں کوشش کرے گی۔موبائل کمپنیاں بھی اس سلسلے میں سنجیدگی سے کوشش کر رہی ہیں۔اس ٹیکنالوجی سے یقیناً ہندوستان کی ترقی کو نئی رفتار حاصل ہوگی۔

■

Naseem Sayeed
M.M. Rabbani High School
Kamptee (Maharashtra)

■ جلال الدین خاں راج

کتنی شیریں زبان ہے اردو
علم والوں کی شان ہے اردو
دور کرتی ہماری کمیوں کو
ہاں تلفظ کی جان ہے اردو
دل کی گہرائی میں اتر جائے
کتنی سادہ بیان ہے اردو
ہے بنا جو کئی زبانوں سے
وہ ادب کا مکان ہے اردو
جیت لیتی ہے دل کسی کا بھی
اتنی دلکش زبان ہے اردو
آئینہ ملک اور ملت کا
اپنی تو آن۔بان ہے اردو
توڑ پائے گا اب نہیں کوئی
راج کا وہ گمان ہے اردو

■

Jalaluddin Khan Raj
Near Jama Masjid, Roniyari Tola
Deoria - 274001 (UP)

قاضی مشتاق احمد

ننھا ایڈیٹر

15/ اکتوبر 1993 کو بمبئی میں ایک شاندار جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ بمبئی سے گجراتی زبان میں 'منتھن' (سفر) نامی رسالہ جاری کرنے کی خوشی میں تھا۔ کسی نئے اخبار یا رسالے کا شروع ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ ملک میں ہر روز کوئی نیا اخبار یا رسالہ شروع ہوتا ہے لیکن 'منتھن' کے اس جلسے کی ایک خاص اہمیت تھی کیونکہ اس رسالہ کا ایڈیٹر ایک بارہ سالہ بچہ تھا جو بلڈ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھا۔ اس جلسہ میں بمبئی کے کئی معزز مہمان شامل تھے۔ ہندوجہ اسپتال کا وہ ڈاکٹر بھی تھا جو ملند دیسائی کا علاج کر رہا تھا۔ اس کے اسٹاف کے لوگ نرس، وارڈ بائز وغیرہ بھی آئے تھے۔ دو روز پہلے ہی ملند اسپتال میں اپنا چیک اَپ کرانے گیا تھا۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ وہ اس دنیا میں صرف چند دنوں کا مہمان ہے۔ بلڈ کینسر کے عام مریضوں کی طرح وہ بستر پر پڑے ہوئے موت کا انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی چھوٹی سی زندگی کا ہر لمحہ کوئی کام آجائے۔ ملند کے والد ہری دیسائی گجراتی اخبار 'جنم بھومی' کے معاون ایڈیٹر ہیں۔ ملند کو بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ چھوٹی سی عمر میں ہی وہ شاعری کرنے لگا تھا۔ بلڈ کینسر کے مریض کو تکلیف بھی بہت ہوتی ہے۔ ملند اپنی بیماری اور بیماری سے ہونے والی تکلیف کو بھول جانا چاہتا تھا اور اپنے آپ کو کسی اچھے کام میں مصروف رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے والد کا تعلق اخباروں کی دنیا سے تھا اس لیے انھوں نے ملند کو ایک رسالہ نکالنے کا مشورہ دیا۔ ملند نے اپنے والد کے مشورے پر عمل کیا اور 'منتھن' کا پہلا شمارہ بازار میں آگیا۔ ملند کا خیال تھا کہ رسالہ نیا ہے اس لیے اس کی زیادہ کاپیاں نہیں بک سکیں گی۔ اس لیے اس نے صرف پندرہ سو کاپیاں چھاپیں جو دو دن میں بک گئیں۔ ٹریول کارپوریشن نے دو سو کاپیاں منگوائیں لیکن 15 سو کاپیاں پہلے ہی بک چکی تھیں۔

اخباری دنیا کے کام کاج میں مصروف ہو کر ملند دیسائی

اپنی بیماری کو بھول گیا لیکن موت تو گویا دروازے پر ہی اس کا انتظار کررہی تھی۔ وہ ملند دیسائی کو اپنے ساتھ لے کر چلی گئی۔ ملند کا سفر ادھورا رہ گیا لیکن اخباری دنیا میں اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ملند دیسائی کی نظم 'تلاش' کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملند کو بھی اپنے خدا سے ملنے کی جلدی تھی اس نے خدا کو خود اس کے پاس آنے کی دعوت دی۔ وہ اپنے خدا کو تلاش کرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ موت جو اس کی منزل ہے۔

ملند دیسائی کی نظم 'تلاش' کا ترجمہ ہم شائع کر رہے ہیں۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کتنی اچھی تھی۔ اگر وہ کچھ دنوں اور زندہ رہتا تو شاید اس کی شاعری میں اور نکھار آجاتا اور اس کا شمار دنیا کے مشہور شاعروں میں بھی ہوتا۔ ننھے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کا نام تو ہمیشہ یاد رہے گا۔

تلاش

اے خدا!
میں تجھے کہاں تلاش کروں؟
تو کہیں بھی نظر نہیں آتا
کچھ لوگ تجھے مورتیوں میں دیکھتے ہیں
کچھ لوگ تصویروں میں
کچھ لوگ کہتے ہیں تو ہر چیز میں موجود ہے
لیکن تو مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا
میں ایک سیدھا سادا بچہ ہوں
اے خدا!
میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟
تو خود میرے پاس کیوں نہیں آتا؟

مدر ٹریسا

مدر ٹریسا کے نام سے ہر شخص واقف ہے۔ اس بوڑھی اور جسمانی اعتبار سے کمزور نظر آنے والی خاتون نے انسانی خدمات کی وہ مثال قائم کی ہے کہ ان کا نام دنیا بھر میں مشہور ہوگیا ہے۔ ہماری سرکار نے انھیں ملک کا سب سے عظیم خطاب 'بھارت رتن' دیا ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا انعام۔ 'نوبل پرائز' بھی آپ کو مل چکا ہے۔

مدر ٹریسا کلکتہ میں عیسائی راہبہ کی حیثیت سے آئی تھیں۔ آپ نے کالی ماتا مندر کے قریب کالی گھاٹ میں 'نرمل ہردیہ' نامی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے نہایت خلوص کے ساتھ انسانی خدمات انجام دینے کا کام شروع کیا۔ وہ مجبور اور بے کس انسانوں کو سہارا دیتی تھیں۔ انھیں وہ سڑکوں، ندی کے کنارے یا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اٹھا کر اپنے ادارے میں لاتیں۔ انھیں ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ دنیا میں جب بھی کوئی نیک انسان کوئی اچھا کام شروع کرتا ہے تو مطلب پرست اور شرارتی لوگ اسے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

مدر ٹریسا کو بھی اس قسم کے لوگوں نے پریشان کرنا شروع کردیا۔ شرارتی لوگوں کا خیال تھا کہ مدر ٹریسا محض دکھاوے کے لیے انسانی خدمت کا ڈھونگ رچا رہی ہیں۔ ان کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ یہ لوگ اپنی جھوٹی شکایت لے کر پولیس تھانہ گئے۔ تھانے کا پولیس افسر مدر ٹریسا کی خدمات سے واقف تھا۔ اس نے شرارتی لوگوں سے کہا کہ وہ ایک بار مدر ٹریسا کے ادارے میں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ وہ کس طرح انسانی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ پولیس افسر ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر وہاں گیا۔ وہ سب اچانک وہاں پہنچے۔ انھوں نے دیکھا کہ مدر ٹریسا زخموں سے چور ایک مریض کے زخم اپنے ہاتھوں سے دھو کر اس کی مرہم پٹی کر رہی ہیں— اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ کر وہ بے حد شرمندہ ہوئے اور واپس لوٹ گئے۔

ایک بار تو چند غنڈوں نے مدر ٹریسا کو گھیر لیا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ مدر ٹریسا بالکل بھی نہیں گھبرائیں بلکہ انھوں نے نہایت ہمت کے ساتھ ان لوگوں سے کہا:

''اگر میری جان لینے میں تمھیں خوشی ملتی ہے تو بے شک میری جان لے لو مگر ایک بات یاد رکھو میں جب تک زندہ ہوں انسانوں کی خدمت کرتی رہوں گی۔''

مدر ٹریسا کی بے خوفی اور اپنے نیک مقصد کے لیے جان کی بازی لگا دینے کا جذبہ دیکھ کر وہ لوگ حیران رہ گئے اور بے حد شرمندہ ہو کر واپس لوٹ گئے۔

مدر ٹریسا جہاں بھی جاتی ہیں دنیا ان کی راہوں میں پھول بچھاتی ہے۔ وہ ہمارے ملک کی ہی نہیں ساری دنیا کی ماں بن چکی ہیں۔

لاری بیکر

مہاتما گاندھی کی سادگی اور انسانی خدمت کے جذبہ سے صرف ہندوستانی ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں کے لوگ بھی متاثر تھے۔ ان میں ایک نام لاری بیکر کا بھی ہے۔ لاری بیکر نے 1937 میں انگلینڈ کے 'برمنگھم اسکول آف آرکیٹکچر' نامی عالمی شہرت یافتہ اسکول سے آرکیٹیکٹ کی ڈگری حاصل کی اور اسی اسکول میں لیکچرر بن گیا۔ وہ پروٹیسٹنٹ عیسائیوں کی خدمت گزار سماجی تنظیم 'کویکر' کا بھی ممبر تھا۔ اس تنظیم کے ممبران زخمی فوجیوں کی تیمارداری کے لیے جنگ کے میدان میں بھی جاتے تھے۔ لاری بیکر ہمیشہ سے آرکیٹیکٹ تھا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو۔ آرکیٹیکٹ مکانات کی تعمیر کے نقشے بناتے ہیں اور ان ہی کی نگرانی میں عمارتیں، مکانات، بنگلے تعمیر ہوتے ہیں۔ آرکیٹیکٹ ہونے کے علاوہ لاری بیکر سماجی خدمت گزار بھی تھا۔ اس نے مریضوں کی تیمارداری اور فوری طور پر ہونے والے آپریشن کی بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس زمانے میں جاپان اور چین کے درمیان جنگ ہو رہی تھی۔ بیکر

تین سال تک چین میں رہا اور وہاں رہ کر اس نے زخمی سپاہیوں کی خدمت اور تیمارداری کی۔ اس کے علاوہ جذام کے مریضوں کی بھی وہ تیمارداری کرتا تھا۔ اس زمانے میں پانی کے جہاز سے انگلینڈ جانے کے لیے بمبئی کی بندرگاہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ لاری بیکر بھی انگلینڈ جانے کے لیے بمبئی آیا۔ بمبئی سے انگلینڈ جانے والا جہاز تین مہینے بعد جانے والا تھا۔ جہاز کے انتظار میں لاری بیکر بمبئی میں ٹھہر گیا۔ اسی دوران مہاتما گاندھی کا قیام بمبئی کے برلا بھون میں تھا۔ لاری بیکر نے گاندھی جی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس کے دل میں گاندھی جی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ ان سے ملنے کے لیے گیا۔ مہاتما گاندھی اس نوجوان انگریز سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے۔ لاری بیکر نے اُس وقت لمبے چوڑے جوتے پہن رکھے تھے۔ گاندھی جی نے ان جوتوں کے بارے میں دریافت کیا تو لاری بیکر نے بتایا کہ اس نے اس قسم کے جوتے بنانے کی تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ جوتے پرانے اور استعمال کے ناقابل کپڑوں سے بنائے جاتے ہیں۔ جب گاندھی جی کو یہ پتہ چلا کہ یہ نوجوان آرکیٹیکٹ بیماروں اور جذامیوں کی بھی خدمت کرتا ہے تو وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ گاندھی جی نے اس نوجوان انگریز سے کہا ''اس ملک کو تمھاری ضرورت ہے۔'' بیکر نے مزاحیہ انداز میں کہا ''لیکن یہاں تو ''چلے جاؤ'' کے نعرے گونج رہے ہیں'' گاندھی جی نے کہا ''یہ نعرے تمھارے لیے نہیں ہیں۔'' لاری بیکر گاندھی جی سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ 1945 میں اپنی شاندار ملازمت اور انگلینڈ کی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر ہندوستان آ گیا۔ ہندوستان آ کر وہ جذامیوں کی خدمت میں جٹ گیا۔ وہ اسی سلسلہ میں کریم نگر، فیض آباد، سانگلی اور دوسرے شہروں میں گیا۔ اس نے کم خرچ میں مکانات اور کالونیاں بھی بنائیں۔ ہندوستانیوں کی مالی حالت اور پسند کو خیال میں رکھتے ہوئے اُس نے چونا، مٹی، اینٹ، پتھر اور بانس کا استعمال کر کے سستے مکانات بنائے۔ اُس زمانے میں کیرل کے وزیرِاعلیٰ اچیوت مینن تھے۔ انھوں نے اپنی ریاست میں سستے مکانات بنانے کے لیے لاری بیکر کی خدمات حاصل کیں۔ لاری بیکر نے سستے مکانات بنانے کی تحریک کو نئی زندگی بخشی۔ اس نے کئی کتابیں بھی لکھیں جن میں سستے مکانات بنانے کے طریقے سکھائے۔ مٹی سے اچھے اور سستے مکانات بنانا۔ مکانات کو زلزلے کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے طریقے وغیرہ کے بارے میں کتابیں لکھیں۔

1981 میں لاری بیکر کی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'پدم شری' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ انھیں ہندوستان کی شہریت بھی دی گئی۔ اس سے لاری بیکر صحیح معنوں میں ہندوستان کا شہری بن گئے حالانکہ مہاتما گاندھی سے ملاقات کے بعد ہی دل سے ہندوستانی بن چکے تھے۔

■

ماخذ: سچی کہانیاں، مصنف: قاضی مشتاق احمد
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محمد مقصود عالم رضوی

چالاک کون؟

چور یا سپاہی

پیارے بچو! تم کو میں ایک ایسی کہانی سنانے جارہا ہوں شاید اس سے پہلے کبھی نہ سنی ہوگی، بہت پہلے کی بات ہے کہ کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا جو اپنی رعایا میں بہت مشہور تھا۔ یہ حکومت کے تمام کاموں میں اپنے سپاہیوں اور درباریوں سے مشورہ کیا کرتا اور پھر ان کے مشوروں پر عمل بھی کرتا تھا۔ بادشاہ اکثر کچھ سوالات اپنے درباریوں کے سامنے رکھتا اور ان سے جواب طلب کرتا۔ صحیح جواب دینے والوں کو انعام سے نوازتا۔

ایک دن بادشاہ نے اپنے وزیروں کو جمع کیا اور سوال کیا کہ چور اور سپاہی میں چالاک کون ہوتا ہے۔ ایک درباری نے جواب دیا ''چور، بادشاہ نے ثبوت مانگا تو درباری نے کہا کہ آپ جنگل میں چور بن کر جائیے اور چوروں کی ٹولی کے ساتھ کام کیجیے آپ کو ثبوت مل جائے گا۔''

ایک رات بادشاہ چوروں کے بھیس میں جنگل میں اکیلا چلا گیا اور ایک جگہ بیٹھ کر چوروں کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد وہاں تین چور آئے۔ انھوں نے بادشاہ کو پہچانا نہیں اور پوچھنے لگے تم کون ہو؟ بادشاہ نے کہا کہ میں ایک چور ہوں اور رات میں اپنی ٹولی سے بچھڑ گیا ہوں۔ چوروں نے اس سے کہا تم یہاں سے چلے جاؤ۔ بادشاہ نے اس سے درخواست کی کہ مجھے بھی اپنی ٹولی میں شامل کرلو۔ چور تیار نہیں ہوئے۔ بادشاہ نے بہت منت سماجت کی تو آخرکار ہ راضی ہوگئے اور بادشاہ سے پوچھا کہ تم میں کون سی خوبی ہے؟ بادشاہ نے پہلے ان سے پوچھا کہ پہلے تم اپنی خوبیاں گناؤ پھر میں بتاؤں گا۔ ایک چور نے کہا کہ میں تمام جانوروں کی بولیاں جانتا ہوں۔ اگر کوئی جانور کچھ کہے تو میں بتا سکتا ہوں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ دوسرے چور نے کہا میں ایک بار کسی کی آواز سن لوں تو زندگی بھر اسے یاد رکھ سکتا ہوں اور دوبارہ اس شخص کی آواز سن کر بتا سکتا ہوں کہ یہ کس کی آواز ہے۔ تیسرے چور نے کہا، میں زمین میں چھپے ہوئے خزانے کا پتہ بتا سکتا ہوں۔ کسی بھی گھر میں خزانہ چھپا ہوا ہو تو مجھے اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کے بعد تینوں چوروں نے بادشاہ سے پوچھا کہ اب

تم بتاؤ کہ تمھارے اندر کون سی خوبی ہے جس کی وجہ سے ہم تمھیں اپنی ٹولی میں شامل کرلیں۔ بادشاہ نے کہا۔ کسی بھی مجرم کو کتنی ہی بڑی سزا کیوں نہ ملی ہو خواہ وہ سزائے موت کی سزا ہو میں اگر ایک اشارہ کردوں تو اس کی سزا معاف ہوجائے گی اور وہ مجرم بری ہوجائے گا۔ تینوں چوروں نے مشورہ کیا کہ آدمی کام کا ہے اسے اپنی ٹولی میں شامل کرلینا چاہیے۔ کافی دیر کے بعد یہ طے ہوا کہ آج بادشاہ کے محل میں چوری کرنے کو چلا جائے پھر وہ چاروں محل کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں محل کے قریب انھیں دیکھ کر ایک کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ بادشاہ نے اس چور سے جو جانوروں کی زبان جانتا تھا پوچھا کہ یہ کتا کیا بول رہا ہے۔ چور نے کہا کہ یہ کتا لگتا ہے کہ پاگل ہوگیا ہے کہہ رہا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ ملک کا بادشاہ بھی چل رہا ہے۔ بادشاہ یہ سن کر پہلے ہچکچایا پھر بولا واقعی یہ کتا پاگل ہوگیا ہے اور چاروں محل کی طرف بڑھنے لگے۔ محل کی چہار دیواریں پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اور ایک جگہ رک گئے۔ جو چور خزانے کا پتہ معلوم کرسکتا تھا تمام جگہ کا معائنہ کیا اور اشارہ کیا کہ یہاں خزانہ چھپا ہوا ہے۔ چاروں نے مل کر اس جگہ کی کھدائی کا کام شروع کیا۔ اس کے لیے ہر ایک کو محنت کرنی پڑی۔ زمین کھودتے کھودتے بہت وقت گزر گیا اور صبح ہوگئی۔ چاروں نے مل کر مٹی پھیلا دی اور جھاڑیوں سے گڈھے کو ڈھک دیا۔ چاروں یہ مشورہ کرتے ہوئے کل دوبارہ رات میں محلے میں ملیں گے، اپنے اپنے راستے چل دیے۔ چلنے سے پہلے چاروں چوروں نے ایک دوسرے کو اپنا پتہ بھی بتا دیا لیکن بادشاہ نے اپنی حکمت عملی اپناتے ہوئے اپنا پتہ غلط بتایا۔ صبح ہونے کے بعد بادشاہ محل میں پہنچا اور چوری کے جرم میں تینوں چوروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ تینوں اس بات پر حیران تھے کہ ہماری خبر بادشاہ کو کس طرح ہوگئی۔ تینوں کو دربار میں حاضر کیا گیا۔ تینوں کو محل میں چوری کے جرم میں موت کی سزا سنادی گئی۔ جو چور لوگوں کی بات سن کر نہ بھولنے کی خوبی رکھتا تھا۔ بادشاہ کی آواز سن کر سمجھ گیا کہ بادشاہ چوتھا چور ہے لیکن وہ یہ بات بولنے سے خوف کھا رہا تھا۔ سزا سنانے کے بعد سپاہی تینوں کو پکڑ کر لے گئے۔ دوسرے دن صبح ان کو پھانسی دینی تھی۔ پھانسی کے تختے کے قریب تینوں کو لے جایا گیا اور کھڑا کیا گیا۔ بادشاہ نے تینوں سے ان کی آخری خواہش پوچھی۔ وہ چور جو بادشاہ کو پہچان گیا تھا اس نے کہا کہ کیا تم پھانسی ہونے کے بعد اپنے ہاتھ کا اشارہ کروگے؟ بادشاہ اس کی خوبی کو جان کر حیران ہوا کہ اس نے اس حلیے میں مجھے پہچان لیا۔ بادشاہ نے سزا معاف کرنے کا اشارہ کیا اور سپاہیوں نے تینوں چوروں کو آزاد کردیا۔ دوسرے دن وہ دو چور حیران تھے کہ ایسا کیسے ہوا؟ اس چور نے کہا کہ ہمارے ساتھ اس رات چوتھا چور کوئی اور نہیں بلکہ بادشاہ سلامت تھے۔

بادشاہ نے تینوں کو معاف کیا اور ان کی خوبیوں کو اچھے کام میں استعمال کرنے کے لیے کہا اور اپنے دربار میں نوکری پر رکھ لیا۔ تینوں نے چوری کی عادت چھوڑ دی۔ بادشاہ نے وزیر کو بھی بلایا اور کہا کہ واقعی چور سپاہی سے چالاک ہوتے ہیں لیکن اگر یہی چالاکی وہ اچھے اور نیک کاموں میں خرچ کریں تو سماج کے لیے زیادہ بہتر ہوگا۔ ان تینوں چوروں نے بھی چوری سے توبہ کی اور بادشاہ کے ساتھ حکومتی کاموں میں ہاتھ بٹانے لگے۔

■

Mohd Maqsood Alam Rizvi
M,A, Azad Nagar,
Bohri Qabristan ki Peeche
Bhusawal - (Maharashtra)

شفیق الرحمن صدیقی

گاؤں کا سپوت

کسی گاؤں میں ایک یتیم لڑکا رہتا تھا، اس کا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا، اس کا نام سہمت تھا، وہ دن بھر اِدھر اُدھر گھومتا رہتا، کوئی کام وہ نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔

ایک دن وہ گھومتا پھرتا سڑک پر چلا گیا، صبح کا سہانا موسم تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، اس کے سامنے سے بسیں، کاریں، ٹرک، ٹیکسی اور اسکولی وین آ جا رہی تھیں۔

وہ جب اسکولی وین کو دیکھتا تو بہت خوش ہوتا اور سوچتا یہ بچے آخر روز کہاں جاتے ہیں۔

ایک دن وہ مقررہ وقت پر سڑک پر کھڑا تھا۔ خلاف معمول اسکولی وین اس کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور کا کوئی ضروری سامان چھوٹ گیا تھا۔

سہمت اس اسکولی وین سے لگ کر کھڑا ہوگیا، بچے اسے پہچان گئے تھے۔ اس لیے وہ بھی اس کے قریب آ گئے، اب دونوں میں باتیں ہونے لگیں۔

سہمت نے ان سے پوچھا تم ہر روز کہاں جاتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا ہم اسکول میں پڑھنے جاتے ہیں! اس نے کہا میں بھی چلوں گا، انھوں نے کہا تم کیسے جاؤ گے تمھارے پاس کتاب نہیں، یونیفارم نہیں وہ یہ سن کر بہت اداس ہوگیا۔

اتنے میں اسی وقت ڈرائیور اپنا ضروری سامان لے کر واپس آ چکا تھا، اس نے جب سہمت کو اسکولی بچوں سے باتیں کرتے دیکھا تو اسے بہت برا لگا، اس نے اسے ڈانٹ کر دور بھگا دیا۔

سہمت تو پہلے ہی اداس تھا، اس پر جب ڈانٹ پڑی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ روتا ہوا اپنے گاؤں واپس آیا، گاؤں کے لوگوں نے جب اسے روتے ہوئے دیکھا تو ماجرا پوچھا اس نے روتے ہوئے ساری بات بتائی۔

گاؤں کے لوگوں نے اسے تسلی دی اور اطمینان دلایا کہ

وہ کوئی غم نہ کرے، وہ بھی جلد پڑھنے جائے گا۔ پھر گاؤں کے لوگوں نے مل کر اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے چندہ کیا۔

اس کے بعد گاؤں کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کو اس کا سرپرست بنا کر اسے اسکول بھیجا تاکہ وہ داخلے کی کارروائی میں سہمت کی مدد کرے۔

اگلے دن وہ نوجوان اسے لے کر اسکول گیا اور داخلے کی کارروائی پوری کی۔

شام کو وہ سہمت کو لے کر شہر گیا اور اس کے لیے قلم، کاپی، کتاب، بستہ اور یونیفارم خریدی۔ اب سہمت ادھر ادھر گھومنے کے بجائے روزانہ اسکول پڑھنے جاتا اور خوب دل لگا کر پڑھتا۔ جب اس کے گاؤں کے لوگ پوچھتے تم پڑھ کر کیا کرو گے؟ تو وہ جواب دیتا میں پڑھ لکھ کر اپنے گاؤں کی، سماج کی اور ملک کی خدمت کروں گا!

گاؤں کے لوگ اس کے جواب سے بہت خوش ہوتے اور وہ خوب محنت سے پڑھتا۔

وقت گزرتا رہا اور وہ اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے انٹر پاس کرلیا۔ پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر چلا گیا، جہاں اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہ خود اپنا انتظام کر سکتا تھا۔

پھر جلدی ہی اس نے اعلیٰ تعلیم سے فراغت حاصل کرلی۔ اب اس کو نوکری کی تلاش تھی۔

انہی دنوں تعمیراتی کمپنی کے آفس میں ایک پوسٹ خالی تھی، موقع غنیمت جان کر اس نے اپنی تقرری کی درخواست ارسال کردی۔

کمپنی کے مالک نے اسے آفس میں ملاقات کرنے کو کہا، سہمت آفس پہنچ گیا۔

انٹرویو کے دوران ہی کمپنی کا مالک اس کی ایمانداری، محنت اور لگن جیسی خوبیوں سے متاثر ہوگیا۔ کمپنی کو ایسے لائق و باصلاحیت نوجوان کی ضرورت تھی۔

چنانچہ اس کی درخواست منظور ہوئی اور وہ آفس انچارج کی حیثیت سے ڈیوٹی انجام دینے لگا۔ اب اس کے پاس دنیا کی ہر سہولت موجود تھی، بہترین تنخواہ، عمدہ رہائش اور جدید ترین بائک وغیرہ۔ کئی سال کے بعد ایک دن وہ اپنے فلیٹ میں اخبار دیکھ رہا تھا، برسات کا موسم تھا، باہر ہلکی ہلکی پھوار

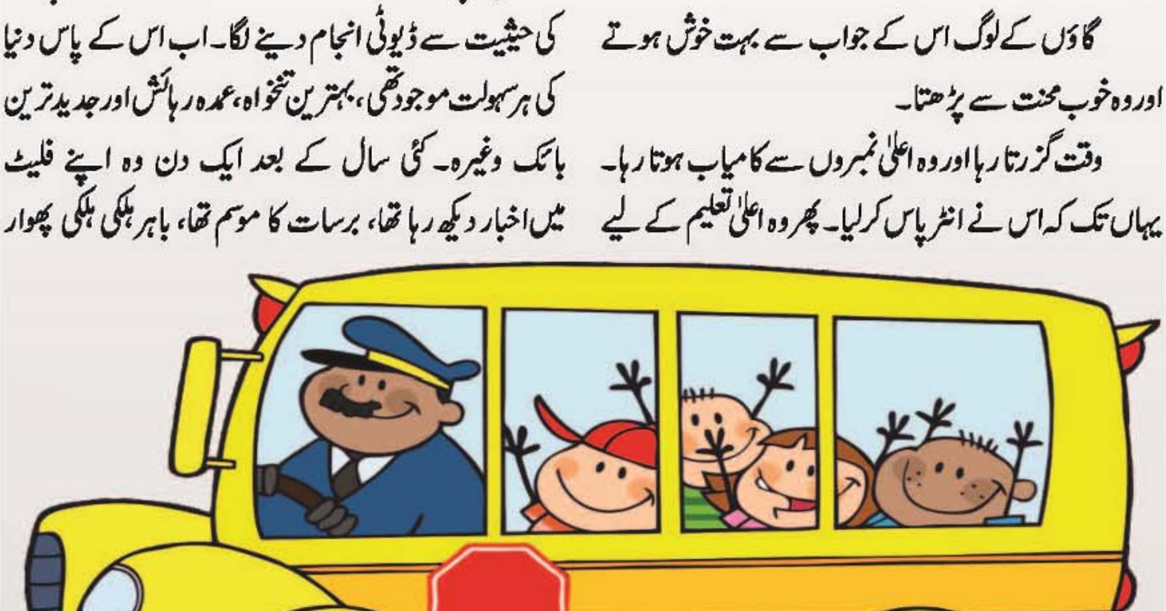

پڑ رہی تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، موسم بے حد حسین تھا۔

اچانک اسے اپنے گاؤں کے بارے میں چھپی خبر سے دماغ چکراتا ہوا محسوس ہوا، سیلاب کی تباہ کاری نے اس کے گاؤں کو تہس نہس کر دیا تھا۔

وہ بے چین ہو اٹھا، اس کا دل دہل اٹھا، فوراً اس نے فون سے کمپنی مالک سے چند روز کی چھٹی لی۔ اور اسی وقت ضروری سامان کے ساتھ اپنی جدید ترین بائک سے طوفان کی سی رفتار سے چند گھنٹوں میں اپنے گاؤں پہنچ گیا۔

اس نے گاڑی کھڑی کی، اپنا سامان ایک طرف رکھا، وہاں چور اچکوں کا کیا ڈر تھا، ہر شخص خود ہی حیران و پریشان تھا۔

سہمت نے اپنی پینٹ کے پائنچے اور آستین اوپر چڑھائی اور پانی میں چھلانگ دی، راحت رسانی اور بچاؤ کے کام میں لگ گیا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ یہ سہمت ہے تو لوگ اسے برا بھلا کہنے لگے، کوئی کہتا ارے اس خود غرض اور مطلب پرست حرام زادے کو دیکھو ہم نے بچپن میں اس کو دیکھا بھالا، چندہ کر کے پڑھایا لکھایا۔ اب خود عیش کر رہا ہے اور گاؤں کو بھول گیا، برسوں تک ہماری خبر نہ لی، بڑا آیا ہماری مدد کرنے۔

ان سب باتوں سے سہمت کا دل چھلنی ہو رہا تھا، وہ چپ چاپ سنتا رہا، اور برداشت کرتا رہا کسی سے کچھ نہیں کہا۔ چپکے سے اپنا سامان اٹھایا اور بائک سے واپس چلا آیا۔

اگلے دن گاؤں کے قریب ایک ٹرک آیا، اس میں غلہ اناج کپڑے اور ضروریات زندگی کا ہر سامان موجود تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے ان سب سامانوں کو اتارنے کے لیے گاؤں والوں سے مدد مانگی۔

گاؤں والے یہ سب چیزیں ٹرک سے اتارنے میں تیار ہو گئے اور ایک گھنٹے میں ٹرک خالی ہو گیا، گاؤں کے نوجوان، بڑے بوڑھے اور عورتیں سب حیرت میں تھے۔

ڈرائیور نے ان کی حیرانگی بھاپ لی اور کہا پہلے تم لوگ اپنے مکھیا کو بلاؤ۔

مکھیا کو بلایا گیا تو ڈرائیور نے کہا، بڑے میاں یہ گاؤں مسٹر سہمت کا ہی ہے نہ۔

مکھیا نے سر ہلا کر جواب دیا، ہاں، ہاں۔

ڈرائیور نے کہا تم لوگ بے فکر رہو۔ یہ ساری اشیا تم لوگوں کے لیے ہیں اور بڑے میاں تم یہ چیزیں گاؤں والوں میں بانٹ دو۔

اس کے بعد ڈرائیور نے ٹرک گھمایا اور واپس چلا گیا۔

چند روز کے بعد سہمت اپنے گاؤں والوں کی خبر لینے اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ گاؤں کے لوگ اب بہت خوش تھے۔ جوں ہی انھوں نے سہمت کو اپنے سامنے دیکھا، شرم سے سر جھکا لیا۔

اس نے بولنا شروع کیا، مرے بڑے بڑے لوگو اور نوجوانو! آج تم لوگ کسی چیز کا افسوس نہ کرو۔ میں اپنا وعدہ بھول کر شہر کی زندگی میں کھو گیا تھا۔ اب تم لوگ مطمئن رہو کیونکہ آپ کا یہ سہمت نوکری پر ٹھوکر مار چکا ہے۔ اب یہ آپ کا سہمت گاؤں سے کبھی باہر نہیں جائے گا۔ گاؤں کی ترقی میں اور اس کی خوش حالی میں جی جان سے لگ جائے گا۔

واقعی سہمت پھر کبھی شہر میں نوکری کرنے نہیں گیا۔

■

Shafiqur Rahman Siddiqui
Mohalla Bansa,
Post: Kurthi Jafar Pur - 275305
Distt. Mau (UP)

منظر مظفر پوری

لائف اسٹائل

انور ایک ذہین لڑکا تھا۔ تکنیکی سائنس میں اُس کی دلچسپی اور قابلیت کی سبھی تعریف کرتے تھے۔ اس نے تکنیکی سائنس سے متعلق کچھ ایسے خاکے تیار کیے تھے، جس کی تعریف مختلف سائنسی اداروں کے علاوہ سرکار نے بھی کی تھی۔

لیکن انور نے اپنی تکنیکی سرگرمیوں میں خود کو کچھ اتنا مصروف کرلیا تھا کہ اس کی سماجی زندگی کا توازن بگڑنے لگا تھا۔ نہ تو وہ سیر وتفریح اور کھیل کود جیسے پروگرام میں حصہ لے پاتا تھا اور نہ ہی فرینڈ سرکل میں وقت دے پاتا تھا۔ صبح دیر سے اٹھنا اور ٹی وی پر سائنسی علوم سے متعلق پروگرام دیکھنا، کتب بینی اور کمپیوٹر سے گھنٹوں چپکے رہنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ کھانے کے دوران بھی وہ ٹی وی دیکھتا تھا۔ اس لیے اس کی صحت خراب ہونے لگی تھی۔ چہرہ بجھا بجھا نظر آنے لگا تھا اور چشمے کا نمبر بڑھ گیا تھا۔

گھر کے بزرگ حضرات اپنے کام کاج میں کچھ اتنے مصروف رہتے کہ انھیں بچوں کی سرگرمیوں پر خاص توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں مل پاتی تھی۔ ہاں دادی جان اور امی انور کی روش پر اکثر انگلی اٹھاتی رہتی تھیں، لیکن انور کے روزمرہ کے معمولات پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ بس اسکول کا آنا جانا ہی اس کی قدرِ صحت کا ایک واحد ذریعہ بنا ہوا تھا۔

انور کی خراب ہوتی صحت پر گھر کے مرد حضرات کی جب نظر گئی تو انھوں نے انور کو سمجھایا ''دیکھو انور، جدید سائنسی ٹکنالوجی نے اکیسویں صدی میں زبردست ترقی لادی ہے۔ اِس ترقی سے ہماری زندگی پر اچھے اور برے دونوں طرح کے اثرات پڑتے ہیں۔ یہ تو ہمیں سوچنا ہے کہ ٹی وی، کمپیوٹر، موبائل اور دوسرے تکنیکی ذرائع کا استعمال کب، کتنا اور کیوں کیا جائے۔

''آج ٹی وی کے غلط استعمال نے ہماری سماجی زندگی، تہذیب وثقافت اور صحت وتندرستی کو کتنا نقصان پہنچایا ہے اور موبائل... یقیناً اس کی بدولت دنیا سمٹ کر قصبے میں تبدیل ہوگئی ہے۔ سات سمندر پار بیٹھے لوگوں کی خیریت آسانی سے معلوم ہوجاتی ہے لیکن اس کے غلط استعمال کا نتیجہ کچھ یوں بھگتنا پڑ رہا ہے کہ آج ہماری لکھاوٹ میں خوبصورتی نہیں رہی۔ خوبصورت قلمی تحریر دیکھ کر جی خوش ہوجاتا تھا۔ ٹیلی فون، ایس ایم ایس اور واٹس ایپ پر ہمارا انحصار کچھ اتنا بڑھ گیا کہ خط وکتابت اور کسی سے براہِ راست ملاقات کرنے کی روایت ختم ہوگئی۔

اِس کے علاوہ اس طرح کی چیزوں سے نکلنے والی لہریں

دل و دماغ اور آنکھ کان وغیرہ پر جو نقصان دہ اثرات ڈال رہی ہیں، اس کے بارے میں ہم بالکل نہیں سوچتے۔

''انور، اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک ہونہار بچے ہو۔ سائنس اور ٹکنالوجی سے تمھیں اتنا لگاؤ ہے کہ اس میدان میں تم نے اپنی ہنرمندی کی کئی بہترین مثالیں پیش کی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف اک سائنس کو ہی نظامِ زندگی کا مکمل ضابطہ سمجھا جائے۔''

''تمھیں چاہیے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک توازن برقرار رکھو۔ تمھاری صحت کتنی خراب ہوگئی ہے، اس کی تمھیں بالکل پروا نہیں؟ بھئی کسی سائنسی تکنیک پر غور وخوض کرنے کے علاوہ اپنی صحت وتندرسی کے بارے میں بھی سوچو۔''

انور کے بزرگوں نے اُسے بار بار سمجھایا، لیکن اس کی ضد کا کیا کہنا۔ وہ کچھ دن ٹھیک رہتا اور پھر ویسے ہی راتوں کو دیر تک جاگتا۔ پھر وہی سائنسی تکنیک پر تجربہ کاری، کمپیوٹر، موبائل، ٹی وی۔ اس کے باوجود وہ پڑھائی لکھائی کے معاملے میں سنجیدہ تھا جس کی بنا پر وہ امتحان میں کامیاب ہوتا رہا۔

انور کی دوستانہ اور سماجی زندگی سے دوری کا انجام یہ ہوا کہ ایک روز کمپیوٹر پر سخت مصروفیات کے دوران اچانک اس کی آنکھوں میں اندھیرا اُترنے لگا اور پھر بے ہوش ہوگیا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ میڈیکل رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ کمپیوٹر کی ریز (Rays) سے بہت قریب رہنے کے باعث اس کے دل و دماغ اور آنکھ کان وغیرہ پر گہرا اثر پڑا ہے۔ طبی مشورے کے مطابق صحت یاب ہونے کے لیے اس کا نیچرل ماحول میں لمبے عرصے تک رہتے ہوئے میڈیکل ٹریٹمنٹ کرانا بے حد ضروری تھا۔ برقی آلات مثلاً ٹی وی، کمپیوٹر، موبائل اور فیس بک وغیرہ سے فی الحال دور رہنے کی سخت ہدایت بھی کی گئی۔

انور کی صحت یابی کے لیے ڈاکٹر کی ہدایت پر فوراً عمل شروع کیا گیا۔ اسے شہر سے دور اک ایسے علاقے میں رشتے دار کے یہاں بھیج دیا گیا، جہاں چہار سمت فطرت کے حسین مناظر تھے۔ فضا خوبصورت تھی اور وہاں کے لوگ تندرست وخوش تھے۔ اس ماحول میں رہ کر انور کو زندگی کے سسٹم اور اس کی ترقی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

کچھ مہینوں میں انور صحت یاب ہوگیا لیکن ڈاکٹر کی طرف سے پرانے ڈھرے پر چلنے کی سخت ممانعت تھی۔ خود انور نے بھی ٹھان لیا تھا کہ فطری طریقہ حیات کے معاملے میں اب وہ کسی طرح کا کوئی سمجھوتہ نہیں کرے گا کیونکہ زندگی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔

انور اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔ اب وہ سماجی زندگی کو مکمل طور پر انجوائے کر رہا تھا۔ سماجی وثقافتی سرگرمیوں میں شریک ہونا، سیر وتفریح میں دلچسپی لینا اور اچھے دوستوں کے بیچ خوشگوار لمحات شیئر کرنے کے علاوہ صحت وتندرستی کے تئیں سنجیدہ رہنے کو اس نے اپنے روزمرہ کی زندگی کا خاص اصول بنا لیا تھا۔ اس کے علاوہ انور اپنی ہابی کے لیے وقت بھی نکال لیتا تھا۔

انور کو گاؤں کے سیدھے سادے بشاش لوگ بہت یاد آتے ہیں۔ اس نے ان کے لیے ایک اچھی بات سوچی ہے۔ وہ گاؤں کے ہم عمر بچوں کو تکنیکی سائنس کی تعلیم دلوانے میں بھرپور مدد کرے گا کیونکہ انہی کی بدولت انور نے زندگی کا صحیح مطلب سمجھا ہے۔

■

Manzar Muzaffarpuri
C/o Apna Tea Stores, Darbar Market,
Mehdi Hasan Road, Brahmpura, Post: M.I.T
Muzaffarpur - 842003 (Bihar)

سید قمرالحسن

ایک بوڑھی سی عورت کے پاس دو کنگن تھے۔ایک دن وہ ان کوفروخت کرنے کی نیت سے گھر سے نکلی تا کہ ان پیسوں سے کچھ ضروری اخراجات پورے کیے جاسکیں۔ وہ عورت اکیلی تھی۔کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ راستے میں اسے دو ٹھگ ملے۔ جو بھولے بھالے لوگوں کو اپنی باتوں سے بے وقوف بنا کران کو ٹھگ لیا کرتے تھے۔انھوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت اکیلی چلی جارہی ہے تو اس کے پاس پہنچ کر پوچھا کہ ماتا جی کہاں جارہی ہیں؟ بیٹا مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے، شہر جارہی ہوں سنار کی دکان تک، میرے پاس سونے کے دو کنگن ہیں انھیں بیچ کر اپنی ضرورت پوری کروں گی۔

بوڑھی عورت کا جواب سن کر دونوں نے سوچا، موقع اچھا ہے کسی طرح اس سے یہ کنگن حاصل کرنا چاہیے۔ دوسرا ٹھگ بولا پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔ہم بھی شہر ہی کی طرف جارہے ہیں، ساتھ ساتھ ہی چلتے ہیں۔ یہ کہہ کر دونوں بوڑھی عورت کے ساتھ ہو لیے۔تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک بولا ماتا جی کوئی کہانی ہی سناؤ جس سے سفر بھی کٹ جائے اور تھکان بھی نہ معلوم ہو۔

''بیٹا میں بھلا کون سی کہانی سناؤں، تم ہی کچھ کہو۔'' بوڑھی عورت نے جواب دیا......اچھا ہم سناتے ہیں۔مگر بڑی اماں ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ اگر تم نے ہماری کہانی کو جھوٹ کہا تو تم کو ہمیں اپنا ایک کنگن دینا پڑے گا۔

بڑھیا نے ان کی شرط مان لی اور ٹھگ کہانی سنانے لگا۔

''بڑی اماں بہت دنوں کی بات ہے ہمارے دادا جی کے پاس ایک نیلے رنگ کی گائے تھی۔ بڑی خوب صورت اور تندرست، اس کی موٹی موٹی آنکھیں بھی نیلے رنگ کی تھیں۔ لمبے چوڑے کان اور خوبصورت پاؤں۔اس کو گھاس پسند نہیں تھی۔ کھانے میں صرف بادام کھاتی تھی۔ دودھ اتنا دیتی تھی کہ دادا جی کے نوکر دوہتے دوہتے تھک جاتے تھے لیکن دودھ پھر بھی ختم نہ ہوتا تھا۔ اور ماتا جی دادا کہتے تھے کہ اس کی سینگیں اتنی چوڑی اور بڑی بڑی تھیں جیسے کوئی پلنگ ہو۔ دادا جی جب سفر کرتے تھے تو

اس کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ جہاں کہیں رات ہوئی یا آرام کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انھیں سینگوں پر بستر بچھا کر آرام کرلیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ دادی کے ساتھ اپنے گاؤں جارہے تھے کہ راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ خوب جم کر لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف سے دھواں دار گولیاں چلیں۔ ڈاکو تو بھاگ گئے مگر بدقسمتی سے ان کی طرف سے سنسناتی ہوئی ایک گولی دادا جی کی گائے کو آلگی اور وہ بے چاری وہیں ڈھیر ہوگئی۔"

بڑھیا عقلمند تھی وہ سمجھ گئی کہ یہ لوگ مجھے لوٹنا چاہتے ہیں۔ اور جان بوجھ کر ایسی جھوٹی باتیں کہانی میں شامل کررہے ہیں کہ میں یقین نہ کروں۔ اب میں کہانی کو غلط تو کہہ نہیں سکتی، ورنہ ایک کنگن ہاتھ سے جاتا رہے گا۔" یہ سوچ کر اس نے بہت سمجھ داری سے افسوس ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اتنی اچھی گائے کے مرجانے کا مجھے بہت افسوس ہوا۔"

ٹھگوں کا تیر نشانے پر نہیں لگا تھا۔ بوڑھی عورت کو ٹھگنے کی ان کی اسکیم فیل ہوچکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس عورت کو لوٹنے کی دوسری ترکیبیں سوچنے لگے۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے۔ "اچھا ماتا جی اب تم کوئی کہانی سناؤ۔"

"میں کیا سناؤں بیٹا؟" بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"نہیں ماتا جی کچھ تو سنانا ہی ہوگا۔" ٹھگوں نے اصرار کیا۔

بوڑھی عورت سمجھ گئی کہ یہ لوگ ابھی بھی مجھے لوٹنے کی سوچ رہے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں کہا کہ "اچھا بچو، اب میں تمھیں سبق سکھاتی ہوں اور پھر وہ یہ کہتے ہوئے کہانی سنانے کے لئے تیار ہوگئی۔ کہ "بیٹا میری بھی وہی شرط ہے۔ اگر تم نے میری بات کو غلط مانا تو تمھیں مجھے پانچ سو روپے دینے پڑیں گے۔"

"ٹھیک ہے ماتا جی ہمیں منظور ہے۔" ٹھگوں نے جواب دیا۔

تو پھر سنو بیٹا، عورت نے اپنی کہانی سنانا شروع کی اور بولی "میرے پاس ایک بڑا اچھا بیل تھا۔ تندرست اور خوب موٹا تازہ، ایک دن وہ میدان میں گھاس چر رہا تھا کہ ایک دوسرے بیل کے ساتھ اس کی لڑائی ہوگئی۔ لڑائی بھی ایسی کہ دونوں لہولہان ہوگئے۔ ہمارے بیل کے ماتھے پر ایک بڑا سا زخم ہوگیا۔ ہم نے اس کا بہت علاج کروایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک دن بہت تیز آندھی آئی اور ہوا کے ساتھ اڑتا ہوا بنولے کا ایک دانہ اس کے زخم میں آگرا اور پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ اس سے ایک پودا نکل آیا۔ جو راتوں رات اتنا بڑا ہوگیا کہ اس میں کپاس لگنے لگی۔ کپاس بھی ایسی نفیس اور اتنی زیادہ کہ تم سے کیا بیان کروں۔ بیل کے سر پر اتنا خوبصورت اور بڑا درخت ایسا لگتا تھا جیسے چلتا پھرتا باغ ہو۔

اب ہمارے بیل کے چرچے ہونے لگے۔ لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے کے لیے ہمارے گاؤں آنے لگے۔ ہمارے پاس اتنی زیادہ کپاس جمع ہوگئی کہ گھر میں رکھنا مشکل ہوگیا۔ پھر ہم نے مشینیں لگوائیں اور اس کپاس سے دھاگا کاتنے لگے۔ اس دھاگے سے کپڑا بُنا جانے لگا۔ الگ الگ قسموں کے کپڑے بنے جاتے تھے۔ جن میں گرم چادریں بھی تھیں۔ ان چادروں میں سے دو چادریں کہیں چوری ہوگئیں۔ بیٹا یقین کرو یہ چادریں جو تم اوڑھے ہوئے ہو وہی ہیں جو چوری ہوگئی تھیں۔ مہربانی کرکے انھیں واپس کردو۔"

دونوں ٹھگوں نے اپنی چادریں اتار کر بڑھیا کو دے دیں، اور کرتے بھی کیا۔ وعدہ کر چکے تھے کہ کہانی کو سچ مانیں گے۔ ورنہ شرط ہار جاتے۔

"اور بیٹا......" بڑھیا نے اپنی کہانی جاری رکھی۔ ہم نے اس کپاس سے ململ کے تھان بھی بنوائے تھے۔ اُن تھانوں میں سے بھی ایک تھان گم ہوگیا۔ یہ جو تمہارے سر پر پگڑیاں ہیں یہ اسی تھان کی ہیں۔ یہ بھی اتار کر مجھے دے دو۔" ٹھگوں نے مجبوراً پگڑیاں بھی بڑھیا کے حوالے کردیں۔ وہ کسی بھی طرح شرط ہارنا نہیں چاہتے تھے۔

چلتے چلتے شہر نزدیک آ گیا۔ انھیں بھوک بھی لگ رہی تھی۔ بڑھیا نے کہا، بیٹا اب شہر قریب ہی ہے۔ میں اپنے کنگن بیچ لوں تو پھر آرام سے کسی جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ دونوں خاموش ہوگئے اور دل ہی دل میں منصوبے بنانے لگے کہ پہلے بڑھیا کنگن بیچ لے تو پھر کوئی داؤں چلتے ہیں۔ انھیں خیالوں میں غرق وہ بڑھیا کے ساتھ چلتے چلتے شہر پہنچ گئے۔ بازار میں بڑی چہل پہل تھی۔ بڑھیا نے اپنے کنگن ہاتھ سے اتار لیے اور بولی بیٹا وہ سامنے سنار کی دکان ہے تم دونوں یہاں بیٹھو میں اپنے کنگن بیچ کر واپس آتی ہوں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ بڑھیا سنار کی دکان میں داخل ہوئی تو مالک نے پوچھا "کیا چاہیے اماں تم کو؟"

"میں اپنے دو نوکر بیچنا چاہتی ہوں۔ وہ سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔" بڑھیا نے جواب دیا۔

"نوکروں کی تو ہمیں بہت ضرورت ہے اماں، بتاؤ کیا قیمت لوگی ان دونوں کی؟" چھ سو روپے، بڑھیا نے کہا اور بات چار سو روپے پر طے ہوگئی۔ لیکن بیٹا ذرا رک جاؤ، میں ان سے پوچھ تو لوں کہ ان دونوں میں سے ایک بکنا چاہتا ہے یا دونوں۔ بڑھیا نے دکان دار سے کہا۔ اور پھر وہیں سے ان دونوں کو مخاطب کرکے بلند آواز میں پوچھنے لگی کہ بیٹا ایک بیچوں یا دونوں؟ ادھر سے جواب آیا "اماں ایک بیچا کر کیا کروگی، دونوں ہی بیچ دو۔" اس طرح بڑھیا نے بڑی چالاکی سے ان دونوں کو چار سو روپے میں دکاندار کے ہاتھ فروخت کردیا اور ٹھگوں کے پاس آکر کہنے لگی۔ بیٹا کنگن تو بک گئے ہیں تم دونوں یہیں بیٹھو میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔

"اماں ساتھ میں پانی بھی لیتی آنا بڑی پیاس لگ رہی ہے۔" دونوں نے کہا اور بڑھیا اچھی بات ہے کہہ کر وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دکان دار نے آواز دے کر انھیں دکان میں بلایا اور دکان کی صفائی کرنے کا حکم دیا۔ تب ان کو اصل بات معلوم ہوئی۔ دونوں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور دل میں سوچنے لگے کہ یہ تو ہماری بھی نانی نکلی۔

■

Syed Qamrul Hasan
Flat No. 201, Azad Apartments
RZ-2541/28, Tughlaqabad Extn.
New Delhi - 110019

مرتضیٰ ساحل تسلیمی

ترانۂ اتحاد

آؤ دنیا والو! ہم سب میل بڑھائیں آپس میں
اب تک جو کچھ ہوا نہیں وہ کر کے دکھائیں آپس میں
آگے پیچھے جُڑ کر ایسی لائن بنائیں آپس میں
جیسے ملک نہ ہوں یہ سارے ڈبّوں کی اک ریل ہو
دنیا کے سب دیشوں کا آپس میں ایسا میل ہو

بھارت، بنگلہ دیش ہو یا نیپال ہو پاکستان ہو
ترکی، کویت، کے ایس اے، لبنان ہو ایران ہو
چین، فرانس و امریکہ ہو یا پھر انگلستان ہو
اب ان میں لڑنے بھڑنے کا کوئی نہ ہرگز کھیل ہو
دنیا کے سب دیشوں کا آپس میں ایسا میل ہو

ایسے ملیں چنتے ہیں جیسے اینٹیں ہم دیواروں میں
رنگ برنگے پھول گندھے ہوتے ہیں جیسے ہاروں میں
پیار و محبت، امن وسکوں کب رکھا ہے ہتھیاروں میں
لڑنے کا کارن اب دولت، مذہب اور نہ تیل ہو
دنیا کے سب دیشوں کا آپس میں ایسا میل ہو

Murtaza Sahil Taslimi
Moh. Shutar Khana
Rampur - 244901 (UP)

ہارون اختر

چراغ

بادشاہ رستم زماں تخت پر تشریف فرما ہیں۔ دربارِ عام بھرا ہوا ہے۔ دسترخوان پر عمدہ، لذیذ اور ذائقے دار کھانے اور پھل فروٹ موجود ہیں۔ یہاں سیکڑوں غریب، فقیر روزانہ کھانا کھانے آتے ہیں۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔

بادشاہ نے اپنے وزیر کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ مجمع میں جو لڑکا سب سے زیادہ کمزور اور لاغر ہو، اُس کو ہمارے پاس لے کر آؤ۔ وزیر نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں حاضرین پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اور ایک نہایت دبلے پتلے اور کمزور لڑکے کو بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ بادشاہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بادشاہ نے تمام جہانوں کے بادشاہ کے دربار میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس لڑکے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس بچے کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اب یہ بادشاہ کا معمول ہو گیا کہ ہر روز کسی غریب محتاج کے ساتھ کھانا کھائے۔ پرندے شام کو اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے اور غریب بادشاہ کے دربار کی طرف۔ بادشاہ رستم زماں کا نام دور دور تک مشہور ہو گیا۔ انصاف اور رحم دلی کا جب بھی ذکر ہوتا بادشاہ رستم زماں کا نام ادب اور احترام سے لیا جاتا۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ خالق کائنات نے بادشاہ کو عظمت و بزرگی کا تاج پہنا دیا، بال سفید ہونے لگے۔ ایک دن جب بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ بیٹھے میوے کھا رہے تھے۔ وزیر نے عرض کیا، بادشاہ سلامت اگر آپ اجازت دیں تو ناچیز جان کی امان چاہتے ہوئے ایک سوال کرنا چاہتا ہے۔ بادشاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔

وزیر نے کہا، بادشاہ سلامت میری آنکھیں گواہ ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ غریب، مسکین اور محتاج آپ کے دربار میں روزانہ کھانا کھاتے ہیں اور آپ بھی انھیں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ وہ بھی فرش پر بیٹھ کر۔ جہاں تک میں جانتا ہوں آپ نے آج تک کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کی۔ اپنے رب کی بندگی آپ دل و جان سے کرتے ہیں۔ آپ کے دربار سے کوئی سوالی کبھی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔ ایک اور خاص بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ کہ دربار میں بے شمار نوکر چاکر موجود ہیں جو آپ کے ایک اشارے پر اپنی جان نچھاور کر سکتے ہیں۔ پھر بھی

آپ قلعے کی چوٹی پر رکھا ہوا چراغ خود ہی جلاتے اور بجھاتے ہیں۔آخر اس چراغ میں کیا خاص بات ہے۔

بادشاہ نے وزیر کی طرف شفقت سے دیکھا اور ایک لمبی سانس لی۔اور پھر گویا ہوا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔کسی وقت اس شہر میں ایک انصاف پسند بادشاہ رہتا تھا۔جس کا نام عفان نواب جہانگیر تھا۔جو بہت رحم دل، انصاف پسند اور نیک دل تھا۔اس کے انصاف کا دور دور تک چرچا تھا۔دور دور سے لوگ اپنے مقدمات لے کر اس کے دربار میں آتے اور انصاف پاتے۔کبھی کوئی مایوس نہیں لوٹتا۔اس کے دربار میں امیر اور غریب میں کوئی فرق نہ تھا۔ایک روز ایک عورت اپنے نحیف، کمزور و لاغر بچے کے ساتھ دربار میں حاضر ہوئی ۔بادشاہ کو ادب سے سلام کیا اور اسے اپنی داستان سنائی کہ بادشاہ سلامت یہ میرالختِ جگر (بیٹا) ہے۔ میں کئی میل کا سفر کر کے یہاں آئی ہوں۔

ایک غریب عورت ہوں ۔ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پال رہی ہوں ۔چند سال پہلے بھوک کی شدت کی وجہ سے میرے بیٹے نے باہر کھیلتے ہوئے کچھ کھا لیا تھا جس کی وجہ سے اس کا بدن مسلسل سوکھتا جا رہا ہے۔ میں نے بہت علاج کرایا مگر افاقہ نہیں ہوا بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔آپ کے دربار میں بڑے بڑے حکیم اور طبیب موجود ہیں ۔اللہ آپ کی سلطنت کو باقی رکھے ۔ایک ماں اپنے بیمار بچے کے علاج کی خاطر آپ کے دربار میں حاضر ہوئی ہے۔

بادشاہ نے اس عورت کی باتوں کو نہایت توجہ سے سنا اور حکم دیا کہ آج سے تم دونوں ماں بیٹے یہیں رہو گے۔ماں بیٹے ایک دوسرے کو حیرت سے تکنے لگے۔ بادشاہ نے شفقت سے لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے کہا: دیکھو سامنے جو قلعہ دکھائی دے رہا ہے، اُس پر ایک چراغ رکھا ہوا ہے۔ ہر روز طلوعِ آفتاب سے پہلے تمہیں وہ چراغ جلانا ہوگا اور غروب آفتاب سے قبل بجھانا ہوگا۔اس کام کے لیے تمھیں صرف پندرہ منٹ کا وقت ملے گا۔اگر اس چراغ کو جلانے یا بجھانے میں تاخیر ہوئی تو تمہیں سزا نہیں ملے گی بلکہ تمھارے بدلے تمھاری ماں کو کوڑے مارے جائیں گے۔ بچے کو اپنی ماں سے اور ماں کو اپنے بچے سے بے پناہ محبت تھی۔طلوع آفتاب اور غروب کے وقت جب وہ لڑکا چراغ جلانے اور بجھانے کے لیے نکلتا، پورے بدن کی طاقت اس کے پیروں میں آجاتی۔ وہ جتنی تیزی سے دوڑتا تھا وقت اس سے بھی زیادہ تیزی سے گزرتا رہا۔ایک ماں اپنے بچے کے لیے، اس کے روشن مستقبل کے لیے دعائیں کرتی رہی۔صبح و شام کی ٹھنڈی ہوا اور مسلسل دوڑنے کے عمل نے اس ناتواں بچے کو صحت مند، تندرست اور پھرتیلا بنا دیا۔ وہی لڑکا دیکھتے دیکھتے گھوڑ سواری ،تیر اندازی اور تلوار بازی کا ماہر ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کی بہادری کی بدولت کئی جنگیں جیتیں اور اس سے خوش ہو کر اس کو اپنا جانشین بنا دیا۔ چونکہ بادشاہ کی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لیے بادشاہ نے اپنی موت سے قبل ہی تخت و تاج اس کے سپرد کر دیا۔اس لڑکے کا نام تھا رستم زماں... اور یہی وہ چراغ ہے جسے میں خود جلاتا اور بجھاتا ہوں۔

■

Haroon Akhtar
Adab Manzil, Nemat Bagh
Naya Salatar House
Malegaon - 423203 (Maharashtra)

منظور احمد صدیقی

سمندر کی گہرائی

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی گرمی کی چھٹی میں اسکول بند ہوتے ہی میرا گھر مہمان خانہ بن چکا تھا۔ اسی کے ساتھ ہی میری مشکلات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بچوں کے شور اور ان کی شرارتوں کی وجہ سے میں عام طور پر اپنے کمرے میں بند رہتا۔ لیکن وہاں بھی میری 11-10 سال کی نواسی ایمن اکثر آجاتی۔ ایمن دوسرے بچوں سے مختلف مزاج کی ہے۔ اسے کتابوں سے دلچسپی ہے اور سوالات کرنے کی عادت، گھر کے دوسرے افراد اس کی اسی عادت سے پریشان رہتے ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ تر سوال مجھ سے کرتی ہے۔ میں اس کے سوالوں کا جواب دینے کے ساتھ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہوں۔

آج بھی میں اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک میرے کانوں میں آواز آئی نانا جان... نانا جان... میں نے اخبار سے نظر ہٹا کر دیکھا تو سامنے ایمن ایک کتاب لیے کھڑی تھی۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے میری طرف کتاب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نانا جان! دیکھیے اس میں لکھا ہے کہ یہ سڑک سطح سمندر سے تین سو میٹر اونچائی پر واقع ہے۔''

''ہاں لکھا تو ہے مگر اس میں تمھیں کیا پریشانی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''میری پریشانی صرف اتنی ہے کہ میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ سمندر کی گہرائی کیسے ناپی جاتی ہے۔ کیونکہ سمندر تو کافی گہرے ہوتے ہیں اور اتنے گہرے پانی کی پیمائش کیسے کی جاتی ہے۔'' ایمن نے اپنی پریشانی بتائی۔

اچھا.....اچھا.....یہ بات ہے۔ میں تمھیں اس کے بارے میں بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ اس وقت تو میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔ دوپہر کے کھانے پر جب سب بچے اکٹھے ہوں گے اس وقت اس پر بات ہوگی تاکہ اس بات سے سبھی بچے واقف ہو جائیں۔

ٹھیک ہے نانا جان۔ کہتے ہوئے ایمن چلی گئی اور میں پھر اخبار پڑھنے لگا۔

دوپہر کا کھانا کھاتے ہوئے ایمن نے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" کھانا کھانے کے بعد ہم سب لوگ نانا جان کے کمرے میں چلیں گے۔ نانا جان ہمیں یہ بتائیں گے کہ سمندر کی گہرائی کیسے معلوم کی جاتی ہے۔"

مجھے ایمن کی ہوشیاری پر ہنسی آگئی۔ کتنی ہوشیار ہے۔ حقیقت میں وہ اس طرح مجھے یاددہانی کرا رہی تھی۔ بہرحال کھانے کے بعد سب بچے میرے کمرے میں آگئے تو ایمن نے مجھ سے کہا۔" ہاں نانا جان اب بتائیے کہ سمندر کی گہرائی کیسے معلوم کی جاتی ہے۔"

میں نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔" بچوں! یہ بات تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہر چیز کی پیائش الگ الگ طرح سے ہوتی ہے۔ کچھ چیزوں کی پیائش میٹر سے اور کچھ چیزوں کی ناپ لیٹر سے کی جاتی ہے۔ مگر سمندر کی گہرائی کی پیائش کا طریقہ بالکل الگ ہے۔ اس کی پیائش ایک مشین کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ جس مشین کا استعمال اس کام کے لیے کیا جاتا ہے اس کا نام ہے 'ایکو ساؤنڈر' سمندری جہازوں پر یہ مشین لگی ہوتی ہے۔ اس مشین کے ذریعہ 'صوتی لہریں' سمندر کی سطح کی طرف روانہ کی جاتی ہیں اور وہ صوتی لہریں سطح سمندر سے ٹکرا کر واپس آتی ہیں۔ سطح سمندر تک جانے اور واپس آنے میں جو وقت لگتا ہے اسے ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح صوتی لہروں کے سطح سمندر تک جانے اور واپس آنے میں لگنے والے وقت کو آواز کی رفتار کے حساب سے شمار کر کے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اس جگہ سمندر کی گہرائی کتنی ہے۔ صحیح نتائج برآمد کرنے کے لیے کچھ اور باتوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس میں سب سے اہم باتیں یہ ہیں کہ سمندر کے پانی جس میں سے گذر کر صوتی لہریں سطح سمندر تک جا رہی ہیں اس میں نمک کتنا ہے اور حرارت کتنی ہے کیونکہ یہ چیزیں صوتی لہروں کی رفتار کو متاثر کرتی ہیں اس لیے نتائج اخذ کرتے وقت ان باتوں پر خاص طور پر دھیان دیا جاتا ہے۔ صوتی لہروں کے آنے جانے کا یہ سلسلہ برابر چلتا رہتا ہے اور سمندر میں جن علاقوں سے یہ جہاز گزرتے ہیں ان علاقوں سے حاصل ہونے والی اطلاعات اس مشین میں لگی ایک کاغذ کی پٹی پر درج ہوتی رہتی ہیں۔ یہ اطلاعات گراف کی شکل میں ہوتی ہیں۔ یہ گراف سمندری سطح کی اونچی نیچی زمین کو صاف طور پر ظاہر کرتا ہے۔

بچو! سائنس روز بروز ترقی کر رہی ہے۔ ہر میدان میں نئے طریقے استعمال ہو رہے ہیں۔ اس کام میں بھی اب نیا طریقہ اپنایا جانے لگا ہے۔ اب اس کے لیے 'ایکو ساؤنڈر' کی جگہ 'لیزر ساؤنڈر' کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔ اس لیے اب صوتی لہروں کے بجائے روشنی کی لہروں کی رفتار سے نتائج کا شمار کیا جاتا ہے۔

میں نے اپنی بات ختم کی تو ایمن نے دوسرا سوال پوچھ لیا۔

"نانا جان! کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ سب سے گہرا سمندر کس علاقہ میں ہے۔"

"ہاں! اب تک معلوم نتائج کے اعتبار سے سمندر کی سب سے گہری سطح بحرالکاہل میں 'ماریانا' جزیرے کے قریب کے علاقے میں پائی گئی ہے وہاں پانی تقریباً گیارہ کلومیٹر گہرا ہے۔" میں نے بتایا۔

میرا جواب سن کر بچوں کے منہ سے نکلا "اف..... اتنا گہرا۔"

■

Manzoor Ahmad Siddiqui
Danish Mahal, Aminabad
Lucknow - 226018 (UP)

تیسری قسط

مکھانے کی کھیر

مصنف: ذکیہ مشہدی

مصور: فجر الدین

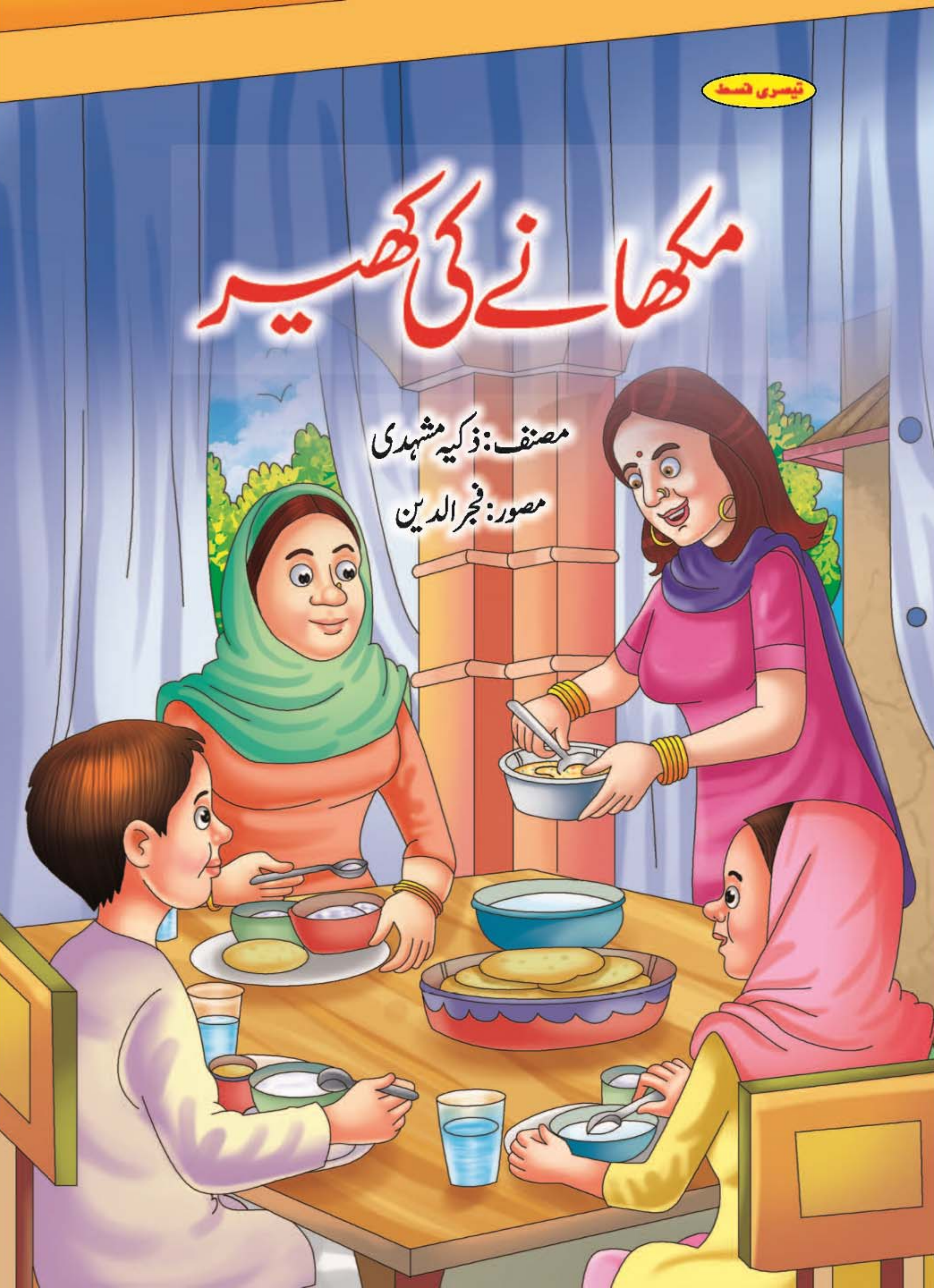

''کیوں؟'' آسیہ نے بھی تابش کو گھور کر دیکھا

''ممی راجن کی ممی سے بات کرلیں گی۔ راجن انھیں ماں کہتا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے ماں کہنا۔''

''ہاں۔ ماں میں بڑی مٹھاس ہے۔'' آمنہ بوا نے کہا۔ ان کی بیچ میں ٹپکنے کی عادت تھی۔ اب ماں کسی کی ہو۔ تابش بھیا کی ہو یا ان کے دوست راجن کی۔''

''انھیں لوگ مسز مہیشوری کہتے ہیں۔ ان کا گھر کا نام مینا ہے۔'' تابش نے اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔ در اصل راجن ان کا اتنا گہرا دوست تھا کہ اسے اس کے گھر کے سب لوگوں کے بارے میں معلوم تھا۔ تابش نے کاغذ کا وہ ٹکڑا ممی کے پرس میں رکھ دیا۔

''بچے کی ضِد ہے۔ بات کر لیجیے نہ بیگم صاحب۔'' آمنہ بوا نے کہا۔

''پتہ نہیں کیسے لوگ ہوں۔ کیا سمجھیں۔ اب بچوں بچوں کی بات الگ ہے۔ تابش ضد کر کے راجن کے گھر چلے گئے تھے۔ ان کا ڈرائیور پہنچا گیا تھا۔''

''ایسے ہی میل جول بڑھتا ہے بیگم صاحب۔ نہ اچھی طرح بات کریں تو مت کیجیے گا۔'' آمنہ بوا کا نام تابش کے پاپا نے عاقلہ بُوا رکھا تھا۔ شاید صحیح رکھا تھا۔

آخر کو تابش کی ممی نے فون ملایا۔

''آداب، میرا نام تہمینہ ہے۔ تہمینہ صدیقی۔ میرا بیٹا تابش راجن کا کلاس فیلو ہے اور گہرا دوست۔''

ادھر سے بڑی گرمجوش آواز آئی۔ ''نمستے۔ نمستے۔ تہمینہ جی۔ تابش بڑا پیارا بچہ ہے۔ ہمارے یہاں آیا تھا۔ لیکن آپ نے کیسے فون کیا۔''

تابش کی ممی نے بتایا کہ ان کے ہاتھ کی مکھانے کی کھیر کھا کے تابش دیوانہ بنا ہوا

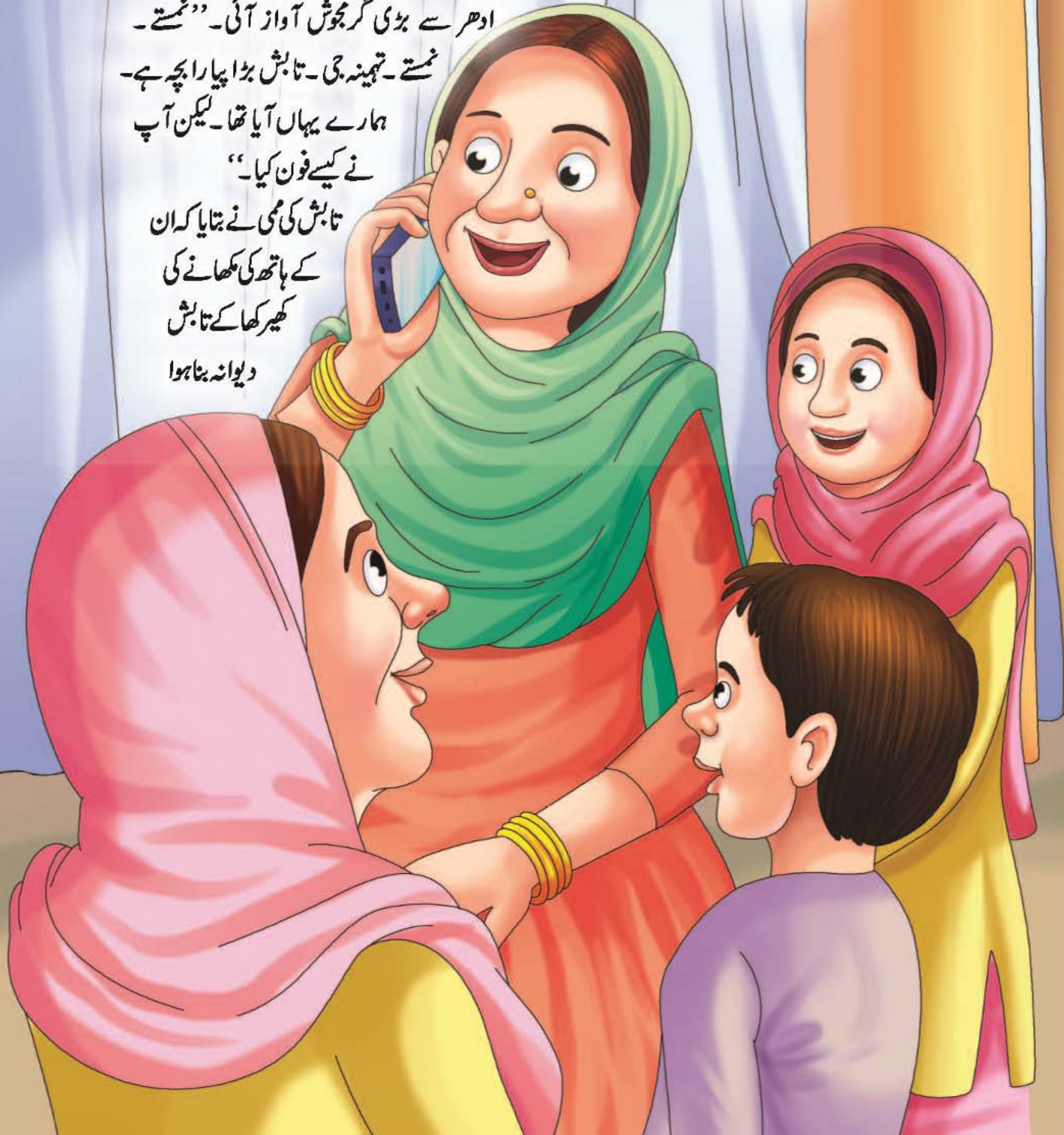

ہے۔اور کہتا ہے کہ ان سے پوچھ کر اس ترکیب سے وہ بھی کھیر بنائیں۔ وہ بے حد خوش ہو گئیں۔ضرور بتائیں گے۔لیکن ایک شرط ہے۔آپ ہمارے یہاں آئیں۔انھوں نے اتنے خلوص سے کہا کہ۔تابش کی ممی نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور جائیں گی۔

”بچوں کو لے کر آیئے گا۔ مینا مہیشوری نے کہا۔تابش نے بتایا تھا اس کی ایک بہن بھی ہے۔“

اتوار کے دن تابش کی ممی دونوں بچوں کے ساتھ راجن کے گھر گئیں۔اس کی ممی لگ بھگ انھیں کی ہم عمر تھیں۔دونوں کا لباس بھی لگ بھگ ایک جیسا تھا۔شلوار قمیص اور دوپٹہ۔

انھوں نے آگے بڑھ کران کا استقبال کیا۔ پھر پرتکلف ناشتہ پیش کیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس میں مکھانے کی کھیر بھی تھی۔ میاں تابش آپ کے تو چھکّے پنجے۔ ممی نے ہنس کر کہا۔ واقعی بے حد لذیذ ہے۔ تابش کی ممی نے ایک چمچ کھیر منہ میں رکھتے ہی کہا۔ ترکیب تو پوچھنی ہی پڑے گی۔

"دوکلو دودھ لیجیے۔ سو گرام مکھانوں کو گھی میں تل کر موٹا پیس لیجیے۔"

(جاری)

مصنف: جولز ورنے
مترجم: شکیل صدیقی

نویں قسط

زمین کی تہہ میں

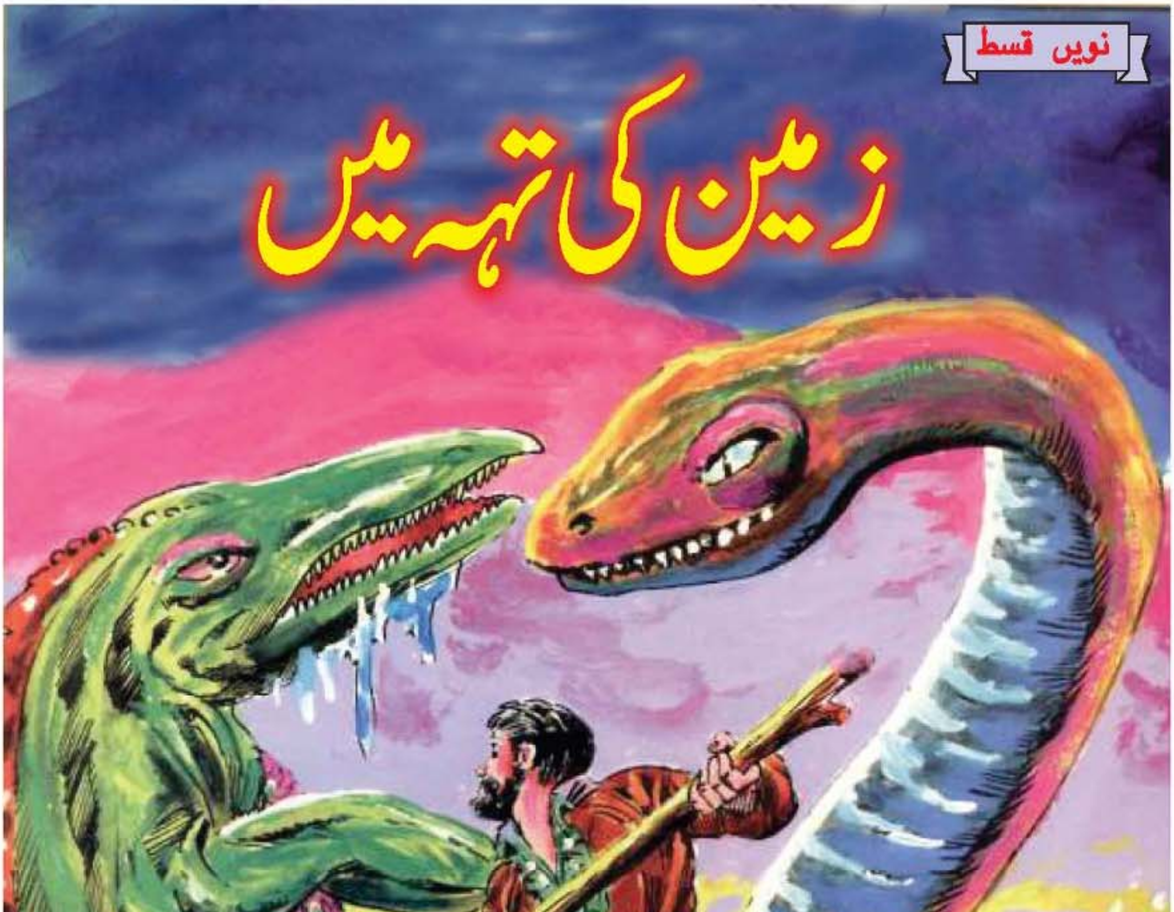

جولز ورنے

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرائیں اور ثقافتی، تاریخی و تہذیبی معلومات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، ارضیاتی اور سائنسی معلومات بھی فراہم کریں۔ یہ ناول پہلے فرانسیسی زبان میں 1864 میں لکھا گیا تھا۔ اِس ناول کا ترجمہ اردو سمیت دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اِس ناول کے مصنف جولز ورنے ہیں جو عالمی ادب میں فادر آف سائنس فکشن کے طور پر مقبول ہیں۔ ان کے ایک ناول Aroundthe World in Eighty Days کو بہت زیادہ شہرت ملی تھی جس کو آپ نے 'بچوں کی دنیا' میں قسط وار پڑھا بھی ہے۔ جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔ 'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ یہ پروفیسر لائڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔ عجیب وغریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اِس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔ اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب وغریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات وارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی، انھیں پرانی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتادیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔ تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔ بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہوگیا۔ آخر کار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اِس خطرناک سفر پر نکل گئے۔ سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔ آئس لینڈ پہنچنے کے بعد ایک رات آرام کیا اور پھر دوسرے دن صبح وہاں کے مشہور آتش فشاں سینی فلز کا سفر شروع کیا۔ یعنی فلز پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھا۔ کئی طوفان اور دیگر پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے چچا بھتیجے سینی فلز کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ چوٹی سے اب آتش فشاں کے اندر اترنے کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ دونوں لوگ سنبھل سنبھل کر زمین کی تہہ میں اترنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد دونوں تقریباً دس ہزار فٹ نیچے پہنچتے ہیں جہاں انھیں ایک عجیب وغریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ آتش فشاں کے لاوے بکھرے پڑے تھے اور ان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دونوں ایک سرنگ میں داخل ہوئے اور سات گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کھلی جگہ میں پہنچے جہاں پودوں اور جانوروں کے ڈھانچے موجود تھے۔ اب دونوں کے پاس پینے کا پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔ سفر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور پریشانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ چٹانوں سے گزرتے ہوئے وہ سب ایک سرنگ میں پہنچے۔ سرنگ سے آگے انھیں کوئلے کی ایک کان ملتی ہے۔ کان میں آگے راستہ بند تھا اس لیے واپس لوٹے، جب تک پینے کا پانی ختم ہو چکا تھا۔ پانی کی کمی کی وجہ سے حالات مزید خراب ہوگئے۔ پروفیسر واپس جانے کو تیار نہیں تھے جبکہ البرٹ اور ہانس کو اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ کوئلے کی کان کے بعد تانبے اور ابرق کی کانوں سے گزرتے ہوئے دو دن اور بیت گئے۔ سارے لوگ نڈھال ہو چکے تھے۔ اس درمیان ایک دریا میں پانی بہنے کی آواز آتی ہے۔ بڑی مشکل سے چٹان توڑ کر ہانس نے پانی پینا چاہا لیکن یہ دریا گرم پانی کا تھا۔ بعد میں یہ پانی ٹھنڈا ہوگیا۔ سبھی لوگ زمین کی تہہ میں اترتے جارہے تھے۔ راستہ مزید مشکل ہوگیا تھا۔ البرٹ پروفیسر سے بچھڑ جاتا ہے اور گرینائٹ کی چٹانوں پر پہنچ جاتا ہے۔ پانی کا چشمہ بھی گم ہوگیا تھا۔ البرٹ کی لالٹین بھی بجھ چکی تھی اور گہرا اندھیرا تھا۔ اچانک البرٹ نیچے گرنے لگتا ہے۔ جب البرٹ کو ہوش آتا ہے تو اسے دور سے چچا اور ہانس کی آواز آتی ہے جو اُسے ہی تلاش کررہے تھے۔ بہت مشکل سے البرٹ اپنے چچا تک پہنچتا ہے۔ اس کے بعد سب لوگ دو دن آرام کرتے ہیں۔ پروفیسر نے کہا کہ اب تیار ہوجاؤ، سمندری سفر پر چلنا ہے۔ البرٹ گھبرا گیا کہ یہاں سمندر کہاں ہے۔ اب آگے

زمین دوز سمندر

شروع میں تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ میری آنکھیں چونکہ روشنی کی عادی نہیں تھیں اس لیے فوراً ہی بند ہوگئیں۔ جب میں انھیں کھولنے کے قابل ہوسکا تو مجھے خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔

''سمندر!'' میں چیخا۔

''بحیرۂ بروک۔'' چچا جان نے کہا۔ ''میں نے اسے دریافت کیا ہے لہٰذا مجھے حق ہے کہ اسے اپنے نام سے پکاروں۔''

دور تک پانی پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ ایک سمندر تھا جس کا ساحل ڈھلوان تھا۔ وہاں سنہری ریت بچھی تھی اور ان پر چھوٹے بڑے گھونگے پڑے تھے۔ لہریں کناروں تک آکر ان سے ٹکرا رہی اور حیرت انگیز گونج پیدا کررہی تھیں۔ ہوا کے ایک جھونکے سے ننھی ننھی بوندیں آکر میرے چہرے پر پڑیں۔ ساحل کے پیچھے چٹانیں تھیں جو کافی بلندی تک چلی گئی تھیں۔

وہ ایک حقیقی سمندر تھا جو وحشیانہ انداز میں جھاگ بہا رہا تھا مگر سنسان پڑا تھا۔

اور وہ روشنی جو مجھے دکھائی دے رہی تھی نہ تو سورج کی روشنی کی طرح گرم اور چمکدار تھی اور نہ ہی چاندنی کی طرح ٹھنڈی اور پیلاہٹ لیے ہوئے تھی۔ وہ سرد، طاقتور اور سیدھی روشنی تھی جیسے کہ بجلی کی روشنی ہوتی ہے!

میرے سر پر ستاروں بھرے آسمان کے بجائے گھرے بادل تھے۔ انھیں دیکھ کر میں افسردہ ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ ان بادلوں کے اوپر گرینائٹ کی چٹانیں ہیں۔

ہم یقیناً کسی غار میں تھے، حالانکہ یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اس کی لمبائی چوڑائی کیا ہے۔ سمندر کی طرح اس کا ساحل بھی اتنی دور تک پھیلا ہوا تھا کہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا، جبکہ میں نے اندازہ لگایا کہ بادل تقریباً بارہ ہزار فیٹ کی بلندی پر تھے۔

اب تک کسی شخص نے ایسا کوئی غار نہیں دیکھا ہوگا جس میں کہ بادل، بجلی کی روشنی اور کشادہ سمندر نظر آئے۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نظارے کو بیان کرنے کے لیے نئے لفظوں کی ضرورت تھی اور میں ایسے الفاظ وضع کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے دیکھا میں نے سوچا پھر حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبے سے اس کی تعریف کی۔

مگر چچا نے ان حیرت انگیز چیزوں کی تعریف نہیں کی۔

''کیا تمھارے بدن میں اتنی طاقت ہے کہ میرے ساتھ تھوڑی دور تک چل سکو؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ چالیس دن تک زمین کے نیچے رہنے کے بعد اس بھیگی ہوئی نمکین ہوا میں سانس لیتے ہوئے خوش گوار لگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تو میرا بازو پکڑلو۔ آؤ اب ساحل کے ساتھ ساتھ چلیں۔'' انھوں نے کہا۔

بائیں جانب جہاں چٹانیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں، پانی ان پر سے بہتا ہوا نیچے گر رہا تھا اور سمندر میں شامل ہورہا تھا۔ وہ ہمارا وفادار چشمہ تھا جس کی رہنمائی میں ہم آگے بڑھ رہے تھے۔

''مستقبل میں یہ ہم سے جدا ہوجائے گا۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''کیا احمقانہ بات ہے۔'' پروفیسر نے ناگواری سے کہا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون سا چشمہ ہمارے ساتھ ساتھ بہتا رہا ہے۔''

تقریباً پانچ سو گز کے بعد ایک عجیب سا جنگل دکھائی دیا۔

اس کے درخت کھلی ہوئی چھتریوں کی طرح لگ رہے تھے اور چونکہ وہاں ہوا نہیں چل رہی تھی لہٰذا وہ ساکت تھے اور پتھر کے بنے لگ رہے تھے۔

انھیں دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی اور میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچ گیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیسے درخت ہیں۔ جب میں اس کے سائے میں پہنچا تو اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''یہ کھمبیوں کا جنگل ہے۔'' چچا نے بتایا۔

وہ درست کہہ رہے تھے لیکن یہ کیسی کھمبیاں تھیں؟ مجھے ایسی کھمبیوں کے بارے میں معلوم تھا جو آٹھ یا نو فیٹ تک کی ہوتی تھیں مگر یہ کھمبیاں سفید تھیں اور ان کی جسامت تیس سے چالیس فیٹ تک تھی، اور ان کے سر بہت بڑے بڑے تھے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھیں اور ایک دوسرے سے اس قدر جڑی ہوئی کہ روشنی کا بالکل گزر نہیں تھا۔

میں کچھ اور آگے جانا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے تک ہم اس ٹھنڈے، مرطوب اور سائے دار جنگل میں گھومتے رہے پھر ساحل کی طرف لوٹ آئے۔

اس کے علاوہ کئی درخت ایسے بھی تھے جن کی پتیاں بے رنگ تھیں۔ یہ ایسے خودرو پودے تھے جو زمین پر نکل آتے ہیں اور کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دیتا، مگر یہاں وہ دیو قامت ہو گئے تھے۔

''شاندار، عمدہ۔'' چچا چیخے۔ ''یہ ہمارے باغوں میں اگنے والے پودے ہیں جو کسی زمانے میں درخت ہوا کرتے تھے۔ البرٹ ان کی طرف دیکھو اور ان کی تعریف کرو اور ذرا ان ہڈیوں کی طرف بھی دیکھو جن پر تم چل رہے ہو۔''

''ہڈیاں'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، ہاں۔ یہ قبل از تاریخ کے دیوزاد جانوروں کی ہڈیاں ہیں۔'' چچا بولے۔

میں نے اس میں سے ایک ہڈی اٹھالی۔

''یہ کسی جانور کا نچلا جبڑا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہ ٹانگ کی ہڈی پڑی ہے۔ یہ جانور اس زمین دوز سمندر کے قریب اور ان دیو قامت پودوں میں رہتے ہوں گے۔ مجھے چند جانوروں کے مکمل ڈھانچے بھی دکھائی دے رہے ہیں۔''

مجھے خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان جانوروں میں سے

کوئی ابھی تک زندہ ہو اور اس سرد جنگل میں گھوم رہا ہو یا کسی چٹان کے پیچھے چھپا بیٹھا ہو۔ میں نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا، مگر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

اس زمین دوز دنیا میں ہم دونوں ہی زندہ مخلوق تھے۔ جب ہوا رک گئی تو وہاں کسی ریگستان سے زیادہ سناٹا طاری ہو گیا۔ میں نے افق کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ سمندر کہاں ختم ہوتا ہے؟ اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی ہے؟ کیا ہم کبھی اسے پار کر سکیں گے؟

چچا جان کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ ہم اسے پار کر سکیں گے۔ جب کہ میں امید اور مایوسی کے بیچ میں تھا، مجھے اندیشے اور وسوسے ڈرا رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد ہم ساحل کے ساتھ ساتھ غار میں واپس آ گئے۔ پھر میں گہری نیند سو گیا۔

میں اگلے روز بیدار ہوا تو پوری طرح صحت مند تھا۔ میں نے تازہ دم ہونے کے لیے چند منٹ تک سمندر میں تیراکی کی، اس کے بعد جب میں واپس آیا تو میری بھوک کھل چکی تھی۔

باورچی ہانس تھا اور اب جبکہ اسے آگ اور پانی دونوں میسر تھے تو وہ معمول سے اچھے کھانے تیار کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کافی پلائی۔ اس سے پہلے مجھے یہ مشروب اتنا خوش ذائقہ کبھی نہیں لگا تھا۔

چچا جان نے کہا "اب سمندر میں مدوجزر پیدا ہو رہا ہے اور ہمیں اس کا مشاہدہ کرنا چاہیے۔"

"مدوجزر؟" میں نے کہا۔

"ہاں، یقیناً۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ چاند اور سورج کا اثر یہاں بھی پڑتا ہے؟"

"کیوں نہیں؟" وہ بولے۔

اس وقت ہم ریتیلے ساحل پر چل رہے تھے اور وہاں موجیں واقعی چڑھ رہی تھیں۔

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "مجھے اپنی آنکھوں پر مشکل ہی سے یقین آ رہا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ زمین کے اندر اتنی گہرائی میں ایک سمندر ہوگا اور اس میں مدوجزر بھی پیدا ہو رہا ہوگا اور یہاں ہوائیں چل رہی ہوں گی اور طوفان بھی آ رہا ہوگا۔"

"کیوں نہیں سوچا تھا؟" چچا نے کہا۔ "کیا اس میں سائنس اور منطق کے خلاف کوئی بات ہے۔"

"کوئی بات خلاف نہیں ہے، بشرطیکہ ہم مرکزی حرارت کے نظریے کو چھوڑ دیں۔"

"ہمفرے ڈیوی کا کہنا صحیح تھا؟"

"یقیناً اور ایسے سمندر اور براعظم اور بھی ہوں گے اور ان میں مچھلیاں بھی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کانٹے اور بنسیاں وغیرہ بنا لینا چاہئیں۔"

"ضرور بنائیں گے البرٹ۔ اس نئے علاقے میں جو کچھ بھی ہے وہ ہمیں دریافت کرنا چاہیے۔"

"مگر چچا جان اس وقت ہم کہاں ہیں؟ میں نے یہ بات آپ سے اب تک نہیں پوچھی؟"

"ہم آئس لینڈ سے آٹھ سو پچھتر میل آ گئے ہیں۔"

"ہم اتنی دور آ گئے ہیں؟ کیا ہمارا قطب نما اب بھی جنوب مشرق کی سمت ظاہر کر رہا ہے؟"

"ہاں۔"

"اور ہم کتنی گہرائی میں پہنچ چکے ہیں؟"

"اٹھاسی میل۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اسکاٹ لینڈ کے برف سے ڈھکے

ہوئے پہاڑ ہمارے سروں پر ہیں؟''

''ہاں۔'' پروفیسر نے قہقہہ لگایا۔''اسے سنبھالنے کے لیے بہت مضبوط سہارا چاہیے، مگر یہ چھت بہت ٹھوس ہے اور اس میں عمدہ قسم کا مسالہ لگا ہوا ہے۔''

''اوہ، میں چھت گرنے سے خوف زدہ نہیں ہوں۔'' میں نے کہا' مگر یہ بتائیے کہ اب آپ کا منصوبہ کیا ہے؟''

''ہم مسلسل نیچے جاتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھیں گے، کیونکہ اب تک ہمیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔''

''مگر اس پانی کے نیچے ہم کیسے جائیں گے؟''

''میں اس پانی میں غوطہ لگانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے توقع ہے کہ دوسرے کنارے پر پہنچ کر ہمیں نئے راستے مل جائیں گے۔''

''آپ کے خیال میں دوسرا کنارہ کتنی دور ہے؟''

''ستر سے سومیل کے درمیان۔''

میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ اندازہ قطعی غلط ہوسکتا ہے کہا: ''اب ہمیں قطعی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے اور کل سے سمندری سفر شروع کردینا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، ہم کل سے بحری سفر شروع کردیں گے۔''

میں نے کہا' مگر کشتی کہاں ہے؟''

''کشتی نہیں میرے بچے، بلکہ لٹھوں سے بنایا ہوا مضبوط اور اچھا بیڑا ہوگا۔''

''بیڑا!'' میں چیخا۔''مگر ایک کشتی کے مقابلے میں بیڑا تیار کرنا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ.....''

''تم اپنا خیال نہ ظاہر کرو البرٹ بلکہ تم کان لگاؤ تو تمھیں سنائی دے گا۔''

''سنائی دے گا۔''

''ہاں ٹھونکنے پیٹنے کی آوازیں۔ ہانس یہ کام پہلے سے کر رہا ہے۔ آؤ دیکھو۔''

پندرہ منٹ تک چلنے کے بعد ہم نے ہانس کو ایک چٹان کے پیچھے قدرتی بندرگاہ پر کام کرتے دیکھا۔ ریت پر ایک نامکمل سا بیڑا پڑا ہوا تھا۔ وہ کسی عجیب سے درخت کے تنوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا، بہت سے تنے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔

''چچا جان یہ کون سی لکڑی ہے۔''

''یہ فوسل لکڑی ہے میرے بچے، ایسی لکڑی جو سمندری پانی کے عمل سے معدنیات میں تبدیل ہوگئی ہے۔''

''یقیناً پھر تو یہ پتھر کی طرح سخت اور وزنی ہوگئی ہوگی۔ اور پانی پر تیر نہیں سکے گی؟''

''ایسے درخت جو پوری طرح سے فوسل نہیں بن سکے ہیں وہ تیر سکیں گے، یہ دیکھو۔'' چچا جان نے کہا پھر ایک ٹکڑا پانی میں پھینک دیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا، مگر چند لمحوں بعد سطح پر ظاہر ہوا اور تیرنے لگا۔

''حیرت انگیز!'' میں نے چلا کر کہا۔

دوسری شام تک بیڑا تیار ہوگیا۔ وہ دس فیٹ لمبا اور پانچ فیٹ چوڑا تھا۔ اس کے تنے آپس میں مضبوط رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کا مستول دو ٹہنیوں پر مشتمل تھا جو آپس میں مضبوطی سے بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے عرشے پر ہمارا ایک کمبل بچھا ہوا تھا۔ ہم نے اسے پانی میں دھکیلا تو وہ پرسکون انداز میں بحیرۂ بروک سمندر پر تیرنے لگا۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل

چمن چمن کے پھول

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
(میر فتح علی شیدا)

اب عطر بھی ملو تو تکلف کی بو کہاں
وہ دن ہوا ہوئے کہ پسینہ گلاب تھا
(مادھورام جوہر)

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
سن رکھو تم فسانہ ہیں ہم لوگ
(منتظر لکھنوی)

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا
(آتش لکھنوی)

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا
(آتش لکھنوی)

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرت انسان پر
فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر
(انشاء اللہ خاں انشا)

جگنو میاں کی دم جو چمکتی ہے رات میں
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں
(اشرف علی خان فغاں)

خیال خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
(میر انیس)

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے
(سالک دہلوی)

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
(نواب واجد علی شاہ اختر)

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے
(شہیر مچھلی شہری)

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے
(مست کلکتوی)

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں
(حیرت الہ آبادی)

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
(وحید الہ آبادی)

بڑے لوگ بڑی باتیں

حضرت خواجہ عثمان ہارونی

دنیا ایک جہنم کی مانند ہے، جہاں خدا کا حصول ناممکن ہے۔
اپنی خواہشات نفس کو جتنا دور رکھو گے، خدا اتنی جلدی میسر ہوگا۔

درویش اپنے احوال کو عوام الناس سے پوشیدہ رکھے۔
درویش اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے نہ گھبرائے۔

حضرت معین الدین چشتی اجمیری

بے بسوں کی مدد کرنا، مجبوروں کی ضرورت پوری کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا عذاب دوزخ سے محفوظ کرتا ہے۔
ہنسی اور قہقہہ کبیرہ گناہ ہے اور قبرستان میں ہرگز نہیں ہنسنا چاہیے کیونکہ قبرستان عبرت کی جگہ ہے ہنسی کا مقام نہیں۔
عارف کی پہچان یہ ہے کہ وہ موت کو عزیز رکھتا ہے اور خدا کے ذکر کے سوا اور کسی شے سے اسے چین نہیں آتا۔
سچا وہ ہے جس کی ملکیت میں کوئی شے نہ ہو اور معاملات دنیا میں کوئی دخل نہ ہو۔
بدترین وہ شخص ہے جو توبہ کی امید پر گناہ کرے۔
مصیبت اور سختی کا آنا صحت اور ایمان کی علامت ہے۔
حسد بہت بری شے ہے اسے دل میں ہرگز جگہ نہ دو
بھوکے کو کھانا کھلانا۔ ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا اور دشمن کے ساتھ اچھا سلوک کرنا نفس کی زینت ہے۔
عارف دنیا اور اللہ کا دوست ہوتا ہے۔
خود پسندی کبیرہ گناہ ہے۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر

انسانوں میں رذیل ترین وہ ہے جو کھانے پینے اور پہننے میں مشغول رہے۔
جو سچائی جھوٹ کے مشابہ ہو اسے اختیار مت کرو۔
نفس کو اپنے مرتبہ کے لیے خوار نہ کرو۔
اگر تم بزرگوں کا مرتبہ چاہتے ہو تو بادشاہوں کی اولاد سے دور رہو۔
جب کوئی مومن بیمار ہو تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بیماری اس کے لیے رحمت ہے جو گناہوں سے اس کو پاک کرتی ہے
وہ شے بیچنے کی کوشش نہ کرو جسے لوگ خریدنے کی خواہش نہ کریں۔
اچھائی کرنے کے لیے ہمیشہ کسی بہانے کی تلاش میں رہو۔
دوسروں سے اچھائی کرتے ہوئے سوچو کہ تم اپنی ذات

سے اچھائی کر رہے ہو۔
کسی سے اس طرح جھگڑا نہ کرو کہ مصالحت کی گنجائش ہی نہ رہے۔
اپنی سرگرمیوں کو لوگوں کی سرد کلامی کی وجہ سے ترک نہ کرو۔
جیسا تو ہے ویسا ہی نظر آ ورنہ اصلیت خود بخود ظاہر ہوجائے گی۔
جو لوگ خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، وہ اسراف کرتے ہیں۔
ہر کسی کی روٹی نہ کھا بلکہ ہر شخص کو اپنی روٹی کھلا۔
جب کوئی کم علم بحث کرے تو فقیر پر لازم ہے کہ اس سے بحث نہ کرے۔
یہ ممکن نہیں کہ جیسی صحبت میں بیٹھے ویسا نہ بنے۔
جو تجھ سے خوف کھاتا ہے تو اس سے ہر وقت ڈرتا رہ۔
اپنے نیک و بد پوشیدہ رکھو۔
اطمینان قلب چاہتے ہو تو حسد سے دور رہو۔
وہی دل حکمت و دانش کا مخزن بن سکتا ہے جو دنیا کی محبت سے خالی ہو۔
درویش وہ ہے جو زبان، آنکھ اور کانوں کو بند رکھے یعنی بری بات نہ سنے، نہ کہے اور نہ دیکھے۔
وہ لوگ جو دوسروں کے سہارے جینے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ تساہل پرست، کم ظرف اور مایوس ہوتے ہیں۔
اے نادان تو اپنے آپ کو پہچان۔
نادان لوگ دوسروں کے مقام تو درکنار اپنا مقام بھی نہیں پاسکتے۔

■

بشکریہ: اقوال زریں، اقبال سائبر لائبریری نیٹ

پنسل کا سفر

* بچو! جب آپ پڑھائی کی شروعات کرتے ہیں تو سب سے پہلے کاغذ اور پینسل کی ضرورت پڑتی ہے۔ آیئے آج ہم یہی جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ پینسل کس طرح اور کن کن چیزں سے تیار کی جاتی ہے۔

(1) یہ لکڑی ہلکی ہوتی ہے۔

(2) مضبوط ہوتی ہے۔

(3) اس میں ایک خاص بو ہوتی ہے جو کیڑوں کو ناپسند ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ پینسل کی لکڑی پر کبھی کیڑا نہیں لگتا۔

(4) یہ لکڑی آسانی سے کاٹی اور چکنی کی جاسکتی ہے۔ اس لکڑی کو خوبصورت بنانے کے لیے روغن اور اس پر نام لکھنے کے لیے المونیم کا استعمال کیا جاتا ہے۔

* اس خول پر خوبصورت ڈیزائن بنا کر نام لکھ دیا جاتا ہے۔ ایک کارخانے میں ایک دن میں تقریباً 30 لاکھ خوبصورت پنسلیں تیار ہوکر بازار میں آجاتی ہیں۔

* کالے سرے کی پنسلوں کے علاوہ رنگین پنسلیں بھی بنتی ہیں جن کا استعمال نقشے اور ڈرائنگ بنانے میں ہوتا ہے۔

* تو بچو! یہ تھا پینسل کا شاندار سفر، پہاڑوں سے نکل کر آپ کے ہاتھوں تک!!...

■

Misbah
XIth, Govt Girls Sr Secondary School
Urdu Medium, Kalan Mahal
Delhi - 110002

فائزہ نوشاد

مدد

کسی گاؤں میں رامؤ نام کا ایک لڑکا رہتا تھا۔ وہ بہت غریب تھا۔ اس کے والدین کی وفات ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی اور ایک بہن رہتی تھی۔ ایک دفعہ دیوالی کا موقع تھا اس موقعے پر اس نے پٹاخے اور دِیا وغیرہ لے کر محلے، گلیوں میں بیچنے شروع کیے۔ بیچتے بیچتے وہ ایک گلی میں پہنچا جہاں اس کی ملاقات ایک آدمی سے ہوئی۔ اس نے رامؤ سے پٹاخے لیے پھر اس سے قیمت پوچھی تو رامؤ نے کہا 650 روپے ہوئے مگر اُس آدمی نے اُسے 500 روپے دیے، اس پر رامؤ نے کہا بھائی جان! اس میں صرف دو تین روپے ہی بچتے ہیں، تو اس آدمی نے کہا لینا ہے تو لو، ورنہ اپنا سامان واپس لو! تو اس آدمی نے رامو کا سامان واپس ٹوکری میں رکھ دیا اور چلا گیا۔ رامؤ نے کہا بھائی جان آیئے آیئے !! وہ نہ سن سکا اور کہا کہ اس سے اچھا میں دکان سے لے لیتا ہوں اور وہ آدمی دکان کی طرف چلا گیا۔

ایک دکان میں جا کر اس آدمی ہے وہ سارا سامان لیا جو رامؤ سے لیا تھا۔ جب اس آدمی نے دوکاندار سے کہا کہ کتنے روپے ہوئے میرے بھائی! اس نے کہا 1150 روپے۔ پھر اس آدمی نے کہا بھائی اتنا لیں گے آپ؟ میں آپ کا پُرانا Customer ہوں۔ Shopkeeper نے کہا کہ بورڈ پر لکھا پڑھ لیں! بورڈ پر لکھا تھا "Fixed Price" تو اس نے کہا کہ آپ ان سامانوں کو رکھیں میں ابھی آتا ہوں۔ وہ آدمی وہاں سے نکل گیا اور رامؤ کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ ہر جگہ گیا مگر اسے رامؤ نہیں نظر آیا۔ تو اس نے ایک چائے والے سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ وہ اُس طرف گیا ہے۔ اسی وقت رامؤ کا دوست آیا اور رامؤ سے کہا کہ بھائی میرے سامان تو بک گئے، تو اُس نے کہا میرا سامان تو نہیں بکا میں کیسے جاؤں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن میرا انتظار کر رہے ہونگے کہ میں ان کے لیے کھلونے اور مٹھائیاں لے آؤں گا۔ اس لیے میں نہیں جاسکتا۔ میرے بھائی تم جاسکتے ہو۔ وہ آدمی رامؤ کی ساری باتیں سن رہا تھا۔ تبھی اس آدمی نے پوچھا کتنے روپے کا ہے؟ تو رامؤ نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ یہ تو وہی آدمی ہے۔

رامو نے کہا کہ آپ تو دکان سے لیں گے نہ بھائی! اُس آدمی نے کہا یہ سب چھوڑو! بتاؤ یہ ٹوکری کتنے کی ہے۔ تو رامؤ نے کہا کہ سب 1100 کا ہوگا۔ اس آدمی نے لے لیا اور رامؤ کو اس آدمی نے 1500 روپے دیے اور اس نے کہا 1100 تمھارا اور باقی تمھاری، بہن کے کھلونے اور مٹھائی کے لئے اس پر رامؤ کو رونا آ گیا!! وہ خوشی خوشی گھر کی جانب چل دیا۔

دوستو! اس کہانی سے ہمیں یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب کہ ہر طرف بڑے بڑے Mall اور دکان ہیں۔ اور آج فٹ پاتھ پر جو غریب لوگ کچھ سامان بیچ کر اپنا گذر بسر کرنا چاہتے ہیں ان سے لوگ کچھ خریدنا پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ لوگ مجبور بھی ہوتے ہیں مگر وہ دست سوال پھیلانا گناہ سمجھتے ہیں اس لیے وہ کچھ سامان بیچ کر اپنی کفالت کرتے ہیں اس لیے ہمیں چاہیے کہ فٹ پاتھ والوں سے بھی سامان خرید لیا کریں تا کہ ہماری بھی ضرورت پوری ہو اور ان چھوٹے تاجروں کی ضرورتیں بھی۔

■

Faiza Naushad
Amina Villa, Darya Pur
Faqeer Bara Masjid
Patna - 4 (Bihar)

■ شمائلہ گل نجمی

سبق

آیان میاں اسکول سے جب گھر آئے تو اپنے جوتے کو اتار کر اُدھر پھینکا اور دوسرے جوتے کا ایک شارٹ لگایا۔ وہ صوفے کے نیچے جا چھپا... شرٹ اُتار کر صوفے پر ڈھیر کر دیے پینٹ اچھال کر باکس پر پھینک دیے۔ واش بیشن میں جیسے تیسے جلد بازی میں ہاتھ منھ دھوئے اور ٹی وی آن کر بیٹھ رہے۔ کارٹون فلم دیکھنے۔ حالانکہ ممی جان نے آیان کو بارہا سمجھایا کہ اپنا سامان درست جگہ پر صحیح طریقے سے رکھا کرو تا کہ دوسرے دن ضرورت پڑنے پر آسانی سے مل سکے۔

آیان میاں کی ایک چھوٹی اور بے حد پیاری بہن اَلذینہ بھی تھی جو انھیں تاکید و تنبیہ کرتی رہتی کہ بھائی جان! یہ کام اس طرح نہیں... اس طرح کیا جاتا ہے۔

اتنے میں ممی جان نے دسترخوان پر کھانا لگا دیا۔ دونوں بھائی بہن کھانا کھانے لگے۔ الذینہ نے اپنا کھانا ختم کر لیا مگر آیان میاں نے حسب معمول آدھا کھانا کھایا اور آدھا کھانا بالکونی کی منڈیر پر کوے کو دیا۔

اچانک انھوں نے دیکھا ایک بکری کا بچہ سیڑھی کا گیٹ کھلا دیکھ کر اندر آ گیا ہے اور مزے سے سبزی کے پتے جو امی نے بالٹی میں ڈالے تھے۔ وہ کھا رہا ہے اس کا ایک بھائی سیڑھی پر ہی کھڑا ہے۔ بچوں کی ماں بکری روڈ پر کھڑی زور زور سے بے تحاشا چلا رہی تھی... میں... میں... جتنے بھی راہگیر تھے حالات کا جائزہ لینے کے لیے تھوڑا رکتے اور یہ ماجرہ دیکھ کر آگے بڑھ جاتے۔

بکری کے بچے نے جب آیان میاں کو دیکھا تو واپس پلٹ کر بھاگا... مگر یہ کیا... جس گیٹ سے وہ آئی تھی وہ گیٹ کسی طرح بند ہو چکا تھا اب حالات یہ تھے کہ گیٹ کے ایک طرف بکری اور دوسری طرف بکری کے بچے شور وغل مچا رہے تھے۔

جب یہ ماجرا آیان میاں نے دیکھا تو اپنی ممی کو بلا لائے ممی نے جا کر گیٹ کھولا۔ گیٹ کھولنا تھا کہ بکری اور اس کے بچے بہت تیزی میں نو دو گیارہ (بھاگ گئے) ہو گئے۔

آیان میاں بھونچکا (حیرت سے) ہو کر دیکھ رہے تھے۔ ممی نے بتایا کہ بکری کے بچے ماں کی بات نہیں سن کر مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔

آیان میاں کو بات سمجھ میں آ گئی اور وعدہ کیا کہ آئندہ سے آپ کی ہر بات مانوں گا اور ایک اچھا انسان بنوں گا۔ ■

Shamaila Gul Najmi
Shahi Mohalla
Dakhana: Kulti
Distt: Pachchim Barduan (WB)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

■ جوابات اسی شمارے میں تلاش کریں

ہنسی کے غبارے

مالک اور نوکر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ نوکر مالک کو بری طرح ہرا رہا تھا۔

بڑی مشکل سے مالک نے نوکر کو آؤٹ کر کے خود کھیلنا شروع کیا۔ نوکر نے بالنگ کرانی شروع کی۔ مالک نے جو ایک بار ہٹ لگائی تو گیند سیدھی باورچی خانے میں گئی۔ نوکر گیند لانے کے لیے بھاگا اندر بیگم صاحبہ سے سامنا ہو گیا۔ انھوں نے ڈانٹ کر کہا۔

ارے کمبخت تو صاحب کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ گھر کا سودا کون لائے گا، جا جلدی سے مجھے سبزی لا دے۔

نوکر سودا بیگم صاحبہ کو دے کر گیند اٹھائے واپس لان میں پہنچا تو دیکھا صاحب ہانپ رہے تھے اور رنز بنا رہے تھے۔

دو سو ایک، دو سو دو، دو سو تین، دو سو چار۔ . .

ماں بیٹے سے، تمھارے آفس میں کام کیسا چل رہا ہے۔

بیٹا: (ماں سے) میرے نیچے 25 آدمی کام کرتے ہیں۔

ماں: تو کیا تو ابھی سے افسر ہو گیا۔

بیٹا: ماں میں اوپر کی منزل پر کام کرتا ہوں۔

ایک صاحب اپنی ڈرائیونگ کا امتحان دینے گئے۔ واپسی پر کسی دوست نے پوچھا... کیوں بھئی... امتحان کیسا رہا۔ بولے... جب میں ہسپتال سے آیا تو اس وقت تک امتحان لینے والا ہوش میں نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں... کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

فقیر راہ گیر سے۔ جناب میں کوئی معمولی فقیر نہیں ہوں۔ میں نے روپے کمانے کے 100 طریقے نامی کتاب لکھی ہے۔

راہ گیر: تو پھر تم دوسروں کے آگے ہاتھ کیوں پھیلاتے ہو۔ ڈھنگ کا کام کرو اور پیسے کماؤ۔

فقیر: جناب عالی کیوں کہ اس کتاب میں پیسے کمانے کا بتایا گیا یہ سب سے آسان طریقہ ہے۔

ایک صاحب نے تقریر شروع کی تو مسلسل کئی گھنٹے تک بولتے رہے... سامعین نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ بہت دیر کے بعد اس نے کہا... میں معذرت چاہتا ہوں... میرے پاس گھڑی نہیں ہے شاید میں آپ کا وقت زیادہ لے رہا ہوں۔

گھڑی آپ کے کس کام کی... سامعین میں سے ایک آواز آئی... آپ کے پیچھے دیوار پر کیلنڈر لگا ہوا ہے۔ وہ دیکھ لیں۔

سمندر میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ جہاز پر کھڑے ہوئے ہدایت کار نے فلم کے ہیرو سے کہا... جیسے ہی میں ایکشن لوں... تم سمندر میں چھلانگ لگا دینا۔ مگر مجھے تو تیرنا نہیں آتا... ہیرو نے کہا۔

کوئی بات نہیں... ہدایت کار نے نہایت سنجیدگی سے کہا... یہ میری فلم کا آخری شاٹ ہے۔

شمشیر علی شرافت علی، درجہ: ہشتم، نور اردو ہائی اسکول، دھولیہ، مہاراشٹر

مہک مختار خاں، اکبر خاں پٹیل اردو پرائمری اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

نازیہ بی ظہیرالدین، نیشنل ہائی اسکول تلودہ، ضلع نندربار، مہاراشٹر

آسماں فاروق منیار، درجہ: ہشتم، اردو اسکول، سبھاش نگر، مہاراشٹر

عاکفہ کریم محمد آصف، ہلال پورہ، مالیگاؤں، ضلع ناسک، مہاراشٹر

سارا آصف خان درجہ: چہارم، سینٹ زویرس اسکول، ٹانڈہ (یوپی)

رقیہ یوسف، درجہ: ششم

میناز شیخ مظفر، درجہ: ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول، سبھاش نگر، تعلقہ شیر پور، مہاراشٹر

خوشنما بی رئیس خان، پرائمری اردو اسکول، رسلپور

مریم صبا سید منظور، درجہ: ششم، فرینڈس اردو پرائمری اسکول، حبیب نگر، امراؤتی، مہاراشٹر

پٹھان عرشیہ فاطمہ طاہر خان، درجہ دہم، قلندریہ اردو ہائی اسکول، منگرول پیر، مہاراشٹر

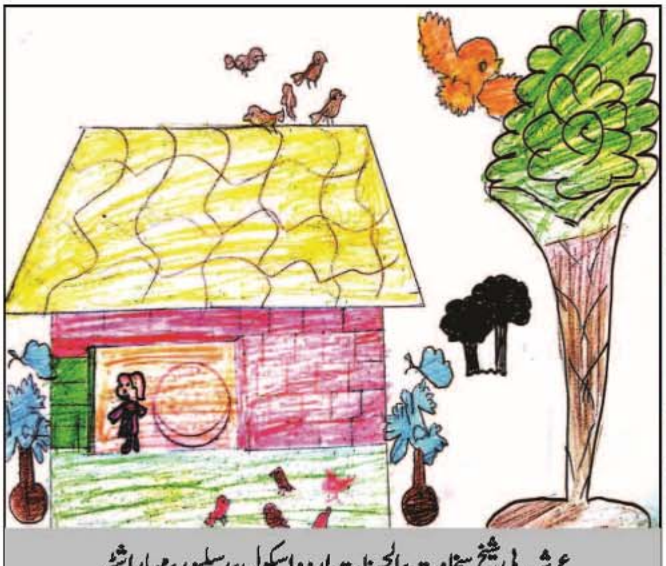

عرشیہ بی شیخ سخاوت، الحسنات اردو اسکول، رسلپور، مہاراشٹر

facebook اردو فیس بک

میں اقرا پبلک اسکول حق نگر سوراپور سیوان بہار میں درجہ ہفتم کی طالبہ ہوں۔ اردو کتب کا مطالعہ کرنا میرے شوق کا حصہ ہے۔ میں اخبار اور دیگر رسائل بھی پڑھتی ہوں۔ میرے ابو ایک ٹیچر ہیں۔ میرے گھر میں مطالعے کا اچھا ماحول ہے۔ 'بچوں کی دنیا' میرے محبوب رسائل میں سے ایک ہے۔ یہ ہر ماہ ہمارے گھر آتا ہے اور نہایت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

درخشاں آفرین بنت عبیداللہ، اسماعیل شہید تکیہ سیوان بہار

میں ایم ایم کالونی سیوان بہار میں رہتا ہوں اور اقرأ کڈس اسکول میں درجہ دوم میں پڑھتا ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا بہت پسند ہے۔ مجھے ادبی لطائف، ہنسی کے غبارے، ڈرائنگ اور اس کی مزیدار کہانیاں پڑھنا پسند ہیں۔ میں نظمیں بھی شوق سے پڑھتا ہوں۔ میں اپنے خالی وقت میں ہی بچوں کی دنیا پڑھتا ہوں۔ بچوں کی دنیا تمام بچوں کو پڑھنا چاہیے تاکہ ان کے علم میں اضافہ بھی ہو اور وقت کا اچھا استعمال بھی ہو۔

فرخ فتح یاب یزدانی، ایم ایم کالونی، سیوان بہار

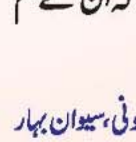

میرا نام محمد اویس ہے۔ میں مدرسہ فاروقیہ سلطان العلوم میں زیرِ تعلیم ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میں ہر ماہ اس کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتا ہوں۔ آپ نے ہم بچوں کو ایک بہت بہترین تحفہ عطا کیا ہے۔

محمد اویس رضوی، مدرسہ فاروقیہ سلطان العلوم، برہان پور، مدھیہ پردیش

میں گورنمنٹ اردو اسکول شاہ پور میں پڑھتا ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں ہمارے اسکول کے کئی بچوں کی کہانیاں چھپی ہیں۔ مجھے اچھا لگا۔ میری بھی کہانی شائع کردیں۔

*اگر آپ کی کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔ (ادارہ)

محمد اظہر شیخ اسماعیل، بڑا بازار، شاہ پور، ضلع برہان پور، مدھیہ پردیش

میں درجہ ہشتم کی طالبہ ہوں۔ مجھے اس مہینے کا بچوں کی دنیا بہت پسند آیا۔ اس رسالے میں آپ کا دماغ کتنا تیز ہے، ہنسی کے غبارے، اقوال زریں اور آؤ اردو سیکھیں بہت اچھے لگے۔

آفرین پروین، نگر پریشد اردو ہائی اسکول، گھاٹنجی، ضلع ایوت محل

میں درجہ ہشتم کی طالبہ ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے اور میں بڑی بے تابی سے نئے شمارے کا انتظار کرتی ہوں۔

افضیاء رؤف خان، نگر پریشد اردو ہائی اسکول، گھاٹنجی، ضلع ایوت محل

میں جماعت ہفتم کی طالبہ ہوں۔ مجھے 'بچوں کی دنیا' بہت پسند ہے۔ ڈرائنگ، آپ کا دماغ کتنا تیز ہے، کہانیاں وغیرہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ جب تک اس کا ہر ورق الٹ الٹ کر نہ دیکھوں میرا دل نہیں بھرتا۔

نازیہ امجد خان، شاہو نگر، جلگاؤں، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

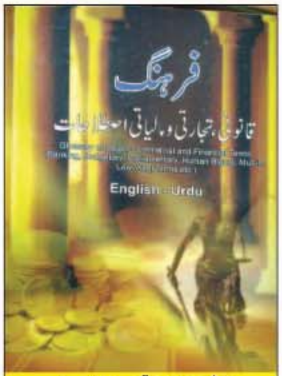

صفحات:713، قیمت:290 روپے

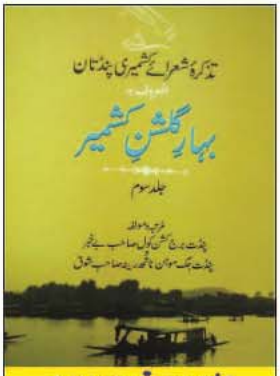

صفحات:602، قیمت:350 روپے

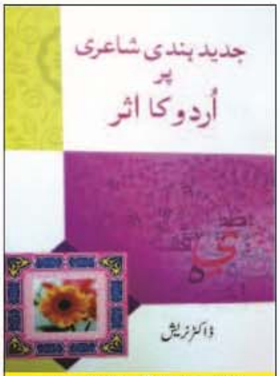

صفحات:155، قیمت: 90 روپے

صفحات: 136، قیمت: 80 روپے

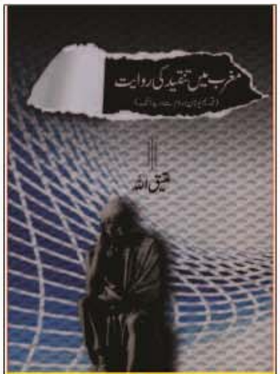

صفحات: 568، قیمت:245 روپے

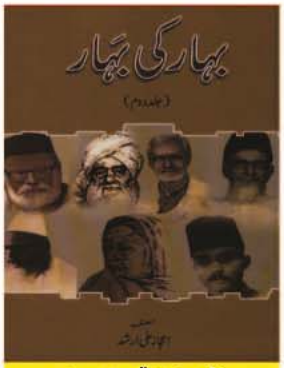

صفحات:242، قیمت:150 روپے

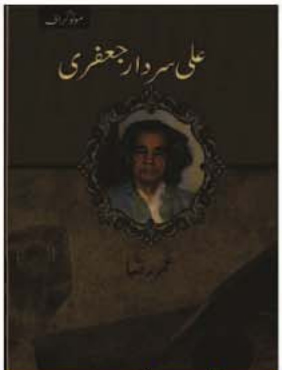

صفحات:165، قیمت: 90 روپے

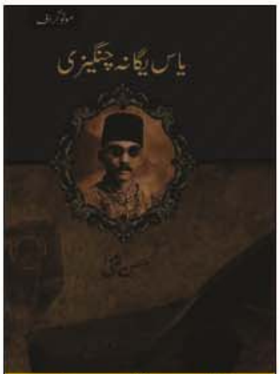

صفحات: 149، قیمت:90 روپے

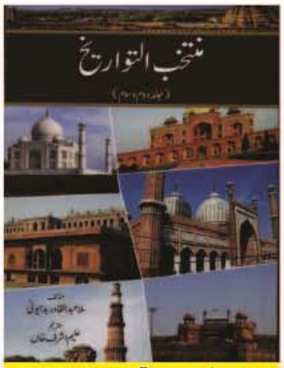

صفحات:215، قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746 فیکس:011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, February 2018, Vol. 06, Issue: 02
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/01/18
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

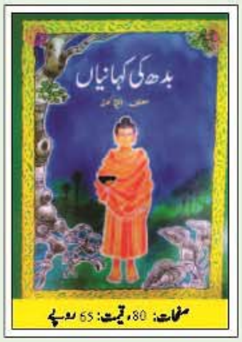

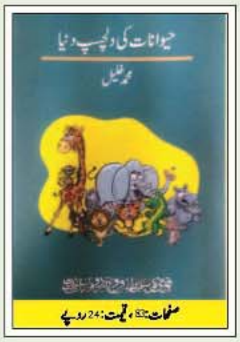

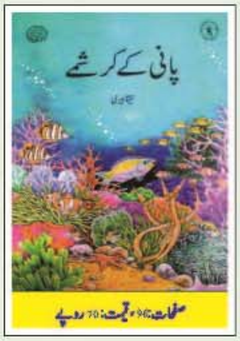

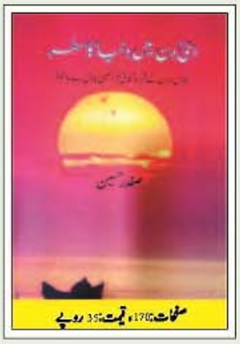

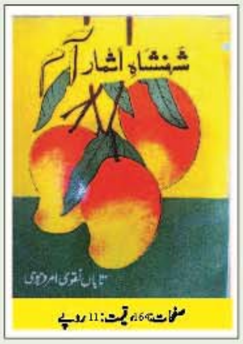

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.